Eli, Eli, lama sabachthani

A Reply to Objection Mullana Sana Ullah Amritsari

By

Allama Barakat Ullah

1957

ایلیٰ ایلیٰ لما شبقتنی

علامہ برکت اللہ

www.noor-e-hayat.com

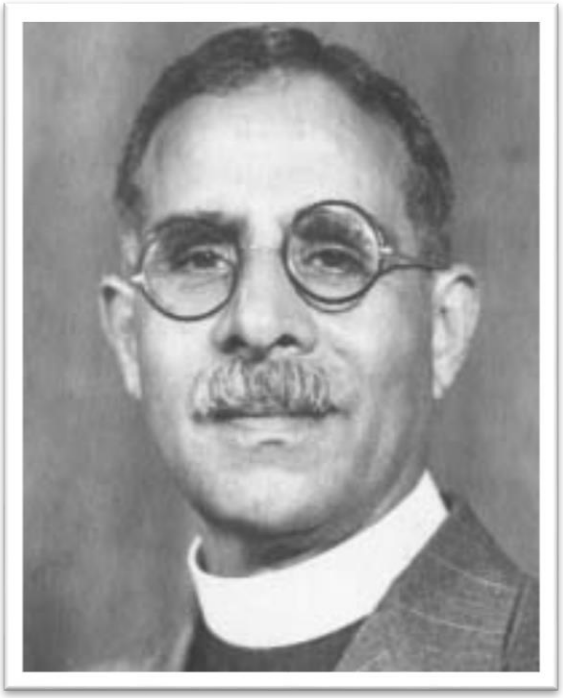

1891-1972

The Venerable Archdeacon

Rev. Barkat Ullah

M.A.F.R.A.S

Fellow of the Royal Asiatic Society London

یادگار

برادر خورد نعمت اللہ مینیجر اخبار اخوت۔ لاہور کی یادگار میں
آپ نے اپنی عمر گرانمایہ حق اور خدمت خلق خاطر وقف کر دی
اور ۲۴ فروی ۱۹۰۷ء خداوند کے دن علے الصبح
خداوند میں آرام سے سو گئے۔

برکت اللہ

فہرستِ مضامین

مولوی ثناءاللہ توہین مسیح کے مرتکب
مولوی ثناءاللہ صاحب کا مناظرانہ رنگ
واقعہ صلیب مسیح اور قرآن
باب دوم۔ مولوی ثناءاللہ صاحب کے اعتراضات کی خامی
مولوی صاحب کی تفسیر
مولوی صاحب کی اخفائے حق کی کوشش
مولوی صاحب کی تفسیر صحیح اصول کے خلاف
مولوی صاحب کی تفسیر اناجیل کے نقیض ہے
سیدنا مسیح کے اقوال
اللہ تعالیٰ کی شہادت
ابنِ اللہ کا طرزِ عمل
انجیل جلیل کی قطعی نص
مولوی صاحب کی تفسیر قرآن کے مخالف
باب سوم۔ آیہ زیر بحث کا مفہوم
فصل اول۔ بائیسواں زبور
بائیسویں زبور کی شانِ نزول
بائیسویں زبور کا مطلب
صیغہ واحد کا استعمال
ایلی ایلی لما شبقتنی کا مفہوم
فصل دوم۔ آیہ زیرِ بحث اور ابن اللہ
سیدنا مسیح نے اس کی تلاوت کیوں کی؟
اختلافِ قرات
آیہ زیر بحث اور مسئلہ کفارہ
آیہ زیر بحث اور مسئلہ لسجم
مولوی صاحبان سے اپیل
مولوی ثناءاللہ اور مسیح کی دعائے مغفرت

دیباچہ طبع اول

آیہ شریفہ ایلی ایلی لما شبقتنی (اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟) انجیل جلیل کی ان معدودے چند (بہت تھوڑی تعداد میں) آیات میں سے ہے جن پر مخالفین عموماً اعتراض کیا کرتے تھے۔ پس ہم نے اس رسالہ میں اس آیت پر مفصل بحث کی ہے تا کہ ان معترضین (اعتراض کرنے والے) کی تشفی خاطر ہو جائے جو صدقِ نیت سے اس کا صحیح مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ایسے ناظرین غور سے اس رسالہ کو پڑھ کر ان تمام حوالہ جات کا مطالعہ کریں گے جن کا ذکر دورانِ بحث میں کیا گیا ہے۔

ہم نے مولوی ثناء اللہ صاحب امر تسری کو اس رسالہ میں اپنا مخاطب بنایا ہے کیونکہ آپ کو شمالی ہند کے مسلمانوں میں خاص شہرت حاصل ہے اور پچاس سال سے زائد عرصہ سے میدانِ مناظرہ میں نبرد آزمائی (مقابلہ) کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں۔ "کہ میری عمر پچیس سال سے متجاوز (اپنی حد سے زیادہ بڑھنے والا) تھی جب میں تحصیل علم سے فارغ ہو کر بالغ العلم ہوا اور ۱۸۹۲ء میں میری دستار بندی[1] ہوئی تھی"۔ (اہلِ حدیث ۲۹ جنوری ۱۹۲۴ء)۔ ہم نے ایک شخص کو اپنا مخاطب بنایا ہے۔ جس کو مسلمان اپنا نمائندہ سمجھتے ہیں۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہم مولوی صاحب موصوف کو متلاشیانِ حق کے زمرہ میں نہیں پاتے کیونکہ ان کی کتاب "اسلام اور مسیحیت" میں جس کا اس رسالہ میں جابجا حوالہ دیا گیا ہے) ہم کو تلاشِ حق کی تڑپ نظر نہیں آتی۔ پس اگرچہ وہ متلاشیانِ حق کی صحیح معنی میں ترجمانی نہیں کرتے اور نہ کر سکتے ہیں تاہم وہ مناظرانہ رنگ میں آیہ کریمہ پر مختلف پہلوؤں سے اعتراض کرتے ہیں اور ان کے اعتراضات کا تسلی بخش جواب حق کے متلاشی کے لئے کارآمد ہو سکتا ہے۔ پس گو ظاہراً طور پر ہمارے مخاطب مولوی صاحب موصوف ہیں تاہم ہمارا روئے سخن درحقیقت ایسے احباب کی طرف ہے جو جستجوئے حق میں سرگرداں ہیں۔

ہم دست بدُعا (دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے ہوئے) ہیں کہ مولوی صاحب بھی اس زمرہ میں شامل ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دردِ دل سے بار بار ان کو توبہ کی دعوت دیتے ہیں تا کہ ع

زاں پیشتر کہ بانگ بر آید ثنا نماند

مولوی صاحب حق کی جانب رجوع کریں اور منجی عالمین کے قدموں میں آئیں جو "راہ حق اور زندگی ہے اور خاکسار کی طرح نجاتِ ابدی سے بہرمند ہوں۔

انارکلی۔ بٹالہ

احقر العباد　　**برکت اللہ**　　۱۵ نومبر ۱۹۴۵ء

[1] ۔ مسلمان روسا کی ایک رسم جس میں مرنے والے رئیس کے بڑے بیٹے کو پگڑی بندھاتے ہیں۔ یا دینی مدرسہ کے فارغ التحصیل طلبہ کو فضیلت کے طور پر پگڑی بندھانا۔

دیباچہ طبع ثانی

مولوی ثناء اللہ صاحب کی کتاب "اسلام اور مسیحیت" ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی۔ ہم نے اخبار اخوت لاہور میں اس کا جواب ۱۹۴۱ء میں لکھا اور اس کے جواب الجواب کا انتظار کرتے رہے لیکن مولوی صاحب نے مرتے دم تک چپ سادھ لی (خاموش رہنا)۔

چار سال تک انتظار کرنے کے بعد ہم نے اس رسالہ میں وہ تمام مضامین شائع کر دیئے جن کا تعلق (مرقس ۱۵: ۳۴) یعنی "اور تیسرے پہر کو یسوع بڑی آواز سے چلّایا کہ اِلوہی اِلوہی لما شَبقتَنی ؟ جس کا ترجمہ ہے اِے میرے خُدا ! اے میرے خُدا !تُو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟" سے تھا۔ مولوی صاحب ابھی زندہ تھے لیکن ان سے اس رسالہ کا کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اب ۱۹۵۷ء میں اس کی دوسری ایڈیشن شائع کی جاتی ہے۔ اس ایڈیشن سے وہ تمام مقامات خارج کر دئے گئے ہیں جن کا تعلق مرحوم کی شخصیت سے تھا۔

میری دعا ہے کہ یہ رسالہ ان سب کو ابنِ اللہ کی صلیب کے نزدیک لے آئے جو حق کی تلاش میں سرگرداں ہیں تا کہ وہ بھی میری طرح نجاتِ ابدی سے بہرور ہو جائیں۔

ہنری مارٹن اسکول۔ علی گڑھ

۲۵ مارچ ۱۹۵۷ء

برکت اللہ

باب اول

مخالفین کے اعتراضات

مقدس مرقس کی انجیل میں وارد ہے:

"جب دوپہر ہوئی تو تمام ملک میں اندھیرا چھا گیا اور تیسرے پہر تک رہا تیسرے پہر کو سیدنا عیسیٰ بڑی آواز سے چلائے کہ الوہی الوہی لما شبقتنی؟ جس کا ترجمہ ہے اے میرے خدا اے میرے خدا آپ نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ جو پاس کھڑے تھے ان میں سے بعض نے یہ سن کر کہا دیکھو وہ الیاس (ایلیاہ) کو بلاتے ہیں۔ ایک نے دوڑ کر سپنج کو سرکہ میں ڈبویا اور سرکنڈے پر رکھ کر آپ کو چسایا اور کہا ٹھہر جاؤ۔ دیکھیں تو الیاس انہیں اتارنے آتا ہیں یا نہیں۔ پھر سیدنا عیسیٰ نے بڑی آواز سے چلا کر دم دے دیا۔ بیت اللہ (ہیکل) کا پردہ اوپر سے نیچے تک پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ صوبہ دار آپ کے سامنے کھڑا تھا اس نے آپ کو یوں دم دیتے ہوئے دیکھ کر کہا بے شک یہ آدمی خدا کا بیٹا ہے"۔

(مرقس ۱۵: ۳۳تا۳۹)

مذکورہ بالا آیات کی بنا پر انجیل جلیل کے بعض مخالفین اعتراض کر کے ان آیات سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ نعوذ باللہ سیدنا مسیح کو خدا نے صلیب پر چھوڑ دیا تھا اور آپ جانکنی کی حالت ((جان نکلنے کی حالت)) میں الٰہی رفاقت سے محروم تھے۔

ایک اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ چونکہ منجی کونین کو خود آخری دم قربتِ خداوندی حاصل نہ تھی۔ آپ کی مبارک موت بنی آدم کی نجات کا وسیلہ نہیں ہو سکتی اور نہ آپ خدا کا مظہر ہو سکتے ہیں۔ پس مسیحی مسئلہ نجات اور مسئلہ تجسم باطل ہیں۔

مولوی ثناء اللہ صاحب مرحوم نے مذکورہ بالا اعتراضات اپنی کتاب "اسلام اور مسیحیت" میں نہایت گستاخانہ الفاظ میں بڑی بے باکی سے کئے ہیں۔ بمصداق "نقلِ کفر کفر نہ باشند" ہم ان کے عامیانہ اور سوقیانہ الفاظ کو ذیل میں نقل کرتے ہیں:

> "ایک طرف تو مسیح کی شخصیت کو خدائے مجسم بتایا جاتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سب قدرتوں اور طاقتوں کا مالک ہے اُدھر اس کو دشمنوں کے ہاتھوں چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح سولی پر چڑھایا جاتا ہے جس پر یہ صادق آتا ہے کہ سپنے اندر راجہ بھئو جاگت بھئو کنگال۔ مسیح اس عاجزانہ حالت میں صلیب پر لٹکے گویا یہ شعر پڑھ رہے ہیں۔
>
> ضعف نے غالب نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے "(صفحہ ۱۰۳)
>
> "غالب علی الکل ہونا خدا تعالیٰ کا خاصہ ہے اور غیر منفک (جدائی کے بغیر) ہے یعنی کسی وقت یا کسی آن میں یہ غلبہ اس کی ذات سے علیحدہ نہیں ہو سکتا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ وہ دشمنوں کے ہاتھوں مغلوب ہو کر اسیر ہوا۔ کانٹوں کا تاج پہنایا گیا۔ اس کی پسلی میں بھالا مارا گیا۔ آخر اس نے ایلی ایلی لما شبقتنی کہتے ہوئے سولی پر چلا کر جان دی۔" (صفحہ ۶۸)۔

"دنیا کی تاریخی کتُب اور مسیحی اناجیل بالاتفاق شہادت دیتی ہیں کہ یہود مسیح کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتے رہے یہاں تک کہ انہوں نے آپ کے سر پر کانٹوں کا تاج رکھ کر آپ کو صلیب پر چڑھادیا اور ہاتھوں میں میخیں گاڑدیں۔ اس حالت میں یسوع مسیح کی یہ فریاد کہ اے میرے خدا اے میرے خدا تونے مجھے کیوں چھوڑ دیا آپ کا صحیح مقام عبودیت (بندگی، عبادت) متعین کرنے کے لئے ایک فیصلہ کن جملہ ہے"۔

"مسیحیت نے دنیا کے بہت بڑے معزز اور خدا کے مقرب اور معصوم ناکردہ گناہ بندے کو پھانسی پر چڑھا کر گنہگاروں کی نجات کا ذریعہ سمجھا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کو نہ تو عدل و انصاف کا اصول مانع آیا اور نہ خدا کے رحم نے اس کو اس ظلم سے باز رکھا۔"

ہمارے دل میں یہ بات آئی ہے کہ ہم یسوع مسیح کے الٰہی اوصاف کا نمونہ تصویر کی شکل میں دکھائیں۔ شاعر لوگ اپنے دلی جذبہ اور محبت اکثر اوقات لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔ مگر گاہے گاہے (کبھی کبھار) مصوروں سے تصویر کشی کی درخواست کرتے ہوئے کہا کرتے ہیں:۔

مصور کھینچ وہ نقشہ جس میں یہ رسائی ہو

ادھر تلوار کھینچی ہو ادھر گردن جھکائی ہو

اسی بنا پر ہم بادل ناخواستہ بقول نصاریٰ مسیح کی شخصیت الٰہی کا خوفناک انجام تصویر میں دکھاتے ہیں۔ مسلمان ناظرین ہمیں معاف رکھیں کیونکہ مکروہ فعل کا ارتکاب کررہے ہیں۔ انجیل متی میں لکھا ہے کہ یسوع مسیح کو صلیب پر چڑھایا گیا۔ اس کے ہاتھوں کو تختے کے بالائی حصہ کے ساتھ ملا کر میخیں گاڑی گئیں اور اس کے سر پر کانٹوں کا تاج پہنایا گیا۔ اس حالت میں اس نے نہایت عاجزی وزاری کے ساتھ چلا کر جان دی۔ جس کا نقشہ اگلے صفحے کی تصویر دیکھنے سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے۔

اس عبارت کے بعد مولوی صاحب نے ایک نہایت کریہہ (قابلِ نفرت) النظر تصویر کھینچ کر اس کے اوپر لکھا ہے "اے میرے خدا! اے میرے خدا! تونے مجھے کیوں چھوڑ دیا (مقولہ در انجیل)" اور تصویر کے نیچے مصرعہ لکھا ہے۔ ع

دیکھے مجھے جو دیدہ عبرتِ نگاہ ہے

اور پھر لکھتے ہیں کہ

"با انصاف ناظرین اگر اس تصویر کو غور سے ملاحظہ فرمائیں گے تو ہماری اس آواز سے متفق ہوں گے کہ ہم حسبِ مضمون آیہ کریمہ لا احب الا افلین ایسی کمزور شخصیت کو خدائی کے لئے پسند نہیں کرسکتے بلکہ ہمارا یقین ہے کہ کوئی بھی اہلِ بصیرت اس کو پسند نہیں کرے گا۔"

(اسلام اور مسیحیت صفحہ ۱۳۱، ۱۳۵، ۱۰۷، تا ۱۱۰)۔

"ہم نے اپنی کتاب اسلام اور مسیحیت میں مسیح کی تصویر کے اُوپر جو فقرہ نقل کیا تھا اس سے ہماری جو غرض تھی اسے ہم منطقی اصلاح میں بتاتے ہیں۔ عیسائیوں کا مسلمہ عقیدہ یہ ہے کہ خدا اور مسیح میں غیر منفک اِتصال چلا آیا ہے۔ یہ مفہوم قضیہ (تکرار) دائمہ مطلقہ ہے۔ ہم نے یہ فقرہ نقل کرکے قضیہ دائمہ مطلقہ عامہ کا ثبوت دیا تھا جو

دائمہ مطلقہ کی نقیض (مخالف) ہے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ذاتِ الوہیت سے مسیح کا اِتصال دائمہ مطلقہ کی صورت میں ثابت نہیں ہے اس کے برعکس قضیہ مطلقہ عامہ کی شکل میں ثابت ہے جو پہلے قضیہ کی نقیض ہے"

(اہلِ حدیث بابت ماہ جون ۱۹۴۲ء)

مسیح کے اس مقولہ سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ الوہیت اور ذاتِ مسیح میں لزوم (لازم) کی نسبت نہ تھی بلکہ ذاتِ الوہیت معاذ اللہ اس شعر کی مصداق تھی۔

سیاہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتاہے انسان

(اہلِ حدیث ۶ فروری ۱۹۴۲ء)

مولوی ثناء اللہ توہین مسیح کے مرُتکب

مولوی صاحب کے مندرجہ بالا الفاظ سے ظاہر ہے کہ اُن کے زعم میں اس آیہ شریفہ سے ابنِ اللہ کی "عاجزی وزاری" (اسلام اور مسیحیت صفحہ ۱۰۸ وغیرہ) ثابت ہوتی ہے۔ اس آیت کی آڑ میں آپ آنخداوند مسیح کی توہین اور تضحیک کرنے سے ذرا نہیں جھجکے۔ (صفحہ ۱۰۷ تا ۱۱۳)۔ آپ کے اس اوچھے (کم ظرف) ہتھیار پر مرزائی تک (جن کو مولوی صاحب ہمیشہ گمراہ کن اور گمراہ شدہ مانتے رہے) انگشت بدنداں (دانتوں میں انگلی دینا، افسوس یا حسرت کا اظہار کرنا) ہیں۔ چنانچہ ایڈیٹر صاحب اُردو ریویو آف ریلجنس قادیان آپ کی کتاب پر ریویو کر کے لکھتے ہیں:

"حضرت مسیح موعود علیہ الصلواۃ والسلام (یعنی آنجہانی مرزا صاحب قادیانی) نے دریدہ دہن پادریوں اور عیسائی مناظرین کے اسلام اور آنحضرت ﷺ پر ناپاک اعتراضات کا الزامی جواب دینے کے لئے جو بائبل اور عیسائیوں کی دیگر تصانیف سے سیدنا عیسیٰ مسیح کی سخت قابل اعتراض شخصیت کو پیش کیا تو مولوی ثناء اللہ صاحب اوران کی قماش کے دیگر مولویوں نے آسمان پر اٹھالیا کہ دیکھو مرزا صاحب نے حضرت عیسیٰ علیہ اسلام کی توہین کر دی۔ لیکن آج مولوی صاحب ایک عیسائی کی کتابوں کا جواب لکھنا پڑا تو آپ نے وہی رنگ اختیار کیا جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلواالسلام (یعنی مرزا صاحب) نے اختیار فرمایا تھا۔ چنانچہ سیدنا عیسیٰ مسیح کے اوصاف کا نمونہ الفاظ کی شکل میں آپ نے (کتاب کے صفحہ ۵۵ سے صفحہ ۱۱۳) تک خوب دکھایاہے۔ پھر اسی پر بس نہ کرتے ہوئے آپ نے اسے تصویر کی شکل میں دکھانا بھی ضروری سمجھا۔ اور صفحہ ۱۰۹ پر حضرت سیدنا عیسیٰ مسیح کو صلیب پر لٹکتا ہوا دکھایاہے اور نیچے کسی قدر تصرف کر کے غالب کا یہ مصرعہ لکھاہے۔

دیکھے مجھے دیدہ عبرت نگاہ ہو

اور اس طرح بقول خود "ایک مکروہ فعل کا ارتکاب کیا"۔ (صفحہ ۵۵ بابت فروری ۱۹۴۲ء)

ہم ان کریہہ النظر شت رو تصویر بنانے والے وہابی مولوی صاحب کی ذہینیت پر حیران ہیں۔ آپ اپنی کتاب پر نازاں ہو کر کہتے ہیں"۔ میں اپنے دلی خیال کا اظہار کرتا ہوں کہ اپنی جملہ تصنیفات میں سے دو کتابوں کی نسبت مجھے زیادہ یقین ہے کہ خدا ان کو میری نجات کا ذریعہ بنائے گا۔ ان

میں سے ایک کتاب "مقدس رسول" ہے جو رنگیلا رسول" کے جواب میں ہے۔ دوسری کتاب یہی "اسلام اور مسیحیت" ہے۔ اس لئے میں کہہ سکتا ہوں۔

روزِ قیامت ہر کسے دردست گیرد نامہ
من نیز حاضرمے شوم تائید قرآں دربغل

(صفحہ الف)

لیکن جہاں تک توہین، تضحیک اور تمسخر کا تعلق ہے مرحوم کی کتاب اس رسوائے عالم کتاب "رنگیلا رسول" سے کم نہیں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مولویوں نے ایک مصنف پر "شاتم رسول" کا فتویٰ دے کر مسلمانوں کو اس قدر برافروختہ کر دیا کہ وہ قتل کر دیا گیا۔ لیکن مسیحی کلیسیا کلمتہ اللہ کی تعلیم اور نمونہ پر چل کر اس قسم کا وطیرہ (چلن) اختیار نہیں کرتی۔ آپ جیسے مولویوں کی ناپاک کوششوں نے مسلمانوں اور عیسائیوں میں (جن کی بموجب آیہ **قرآنی ولتجدن اقرب همه مودة للذين آمنوا الذين قالو انا نصاریٰ**۔ دوستی کے لحاظ سے قریب ترین ہونا چاہیے تھا۔ (سورہ مائدہ صفحہ ۸۵)۔ ایسا افتراق (جدائی، اختلاف) پیدا کر دیا ہے کہ مسلمان حضرت روح اللہ کی شان کے خلاف توہین و تمسخر کے کلمات سن کر نہ صرف ٹس سے مس نہیں ہوتے بلکہ الٹا خوش ہو کر ایسے ایمان فروش مولویوں کو قائد مانتے ہیں۔ اس قسم کے حضرات دعوےٰ کرتے ہیں "تائید قرآن" کا جو فرماتا ہے۔ "اے مسلمانو! تم کہو کہ ہم تو اللہ پر ایمان لائے ہیں اور قرآن جو ہم پر اترا۔ اور اس پر جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کے بارہ بیٹوں پر نازل ہوا اور اس کتاب پر جو موسیٰ اور عیسیٰ کو ملی اور جو دوسرے نبیوں کو ان کے پروردگار کی طرف سے ملا۔ ہم ان کے درمیان کسی بھی کسی طرح کا فرق نہیں کرتے اور ہم اسی ایک خدا کے مطیع ہیں۔" (بقرہ ۱۳۰، ۲۵۸، عمران ۷۸)۔ ان کو یہ خیال نہیں آتا کہ وہ مسیح کی توہین کرنے سے محمد کی تعظیم نہیں کرتے بلکہ اس کی، اس کے اللہ کی اور اس کی کتاب کی بھی توہین کرتے ہیں؟ مرحوم اپنی کتاب کے سرورق کو قرآنی آیت **لا تجادلوا اهل الكتاب الا بالتی احسن** سے مزین کر کے اپنی تمہید میں لکھتے ہیں کہ

"خدا نے ہدایت فرمائی ہے کہ اہل کتاب کے ساتھ بہترین طریق سے مناظرہ کیا کرو"

(صفحہ ۱۲)

لیکن ان کے توہین و تضحیک آمیز الفاظ اس قرآنی آیہ کے ضد ہیں۔ اس قسم کے علماء حضرت روح اللہ کی توہین کر کے قرآن اور اسوہ حسنہ کو ترک کرنے اور اہلِ یہود کی جمعیت العلما کے زمرہ میں شامل ہونے کے جرُم کے مرتکب ہوتے ہیں (متی ۲۷: ۳۹ تا ۴۵)۔ حق تو یہ ہے کہ آنخداوند کا تمسخر اور مضحکہ کر کے وہ مومنین کے گروہ سے نکل کر یہودی کاہنوں، فقیہوں، مجرم مصلوبوں بلکہ بُت پرست رومی سپاہیوں کے زمرہ میں جا شامل ہوتے ہیں۔ **فاعتبروا یا الوالالباب**

ع پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

اس قسم کے بے باک معترض بھول جاتے ہیں کہ "اہل یہود پر اُن کے کفُر کی وجہ سے خدا کی پھٹکار اور لعنت ہے"۔ (نساء آیت ۴۴) اور کہ "اللہ نے ان پر لعنت کی اور ان پر اپنا غضب نازل کیا اور ان میں سے بعض کو بندر اور سور بنا دیا"۔ (مائدہ ۶۵) وہ ایسوں کی پیروی کر کے "قسی القلب" (مائدہ آیت ۱۲) ہو جاتے ہیں۔ اور ان "ناحلف" (مریم ۶۰، اعراف ۱۶۸) یہود کے زمرہ میں داخل ہو کر وجیھاً فی الدنیا والاخرۃ کی توہین کر کے اپنی

آخرت کو خراب کر لیتے ہیں۔ اس قماش کے لوگ حشر کے روز اس قسم کی توہین آمیز کتاب بغل میں لے کر ایک عادل اور کے حضور حاضر ہونے کی جرات کس طرح کر سکیں گے ؟

مولوی ثناء اللہ صاحب کا مناظرانہ رنگ

مولوی صاحب کی کتاب "اسلام اور مسیحیت" کا مطالعہ ثابت کر دیتا ہے کہ آپ مناظرہ کو تلاش حق کا وسیلہ خیال نہیں فرماتے تھے۔ ہاں چند اعتراضات اور دلائل آپ نے رٹ رکھے تھے۔ جو وقت بے وقت، جا اور بے جا آپ اپنی تقریر و تحریر میں پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ مرحوم کو اقبال بھی ہے کہ خاکسار کتابوں میں بحث "نرالے طرز" پر "بصورت جدید" کی گئی ہے بقول حضرت خوش

ع نرالی بحث چھڑی تھی نیا مقابلہ تھا

لیکن جب آپ جواب لکھنے بیٹھے تو وہی پرانے ملانوں کے دقیانوسی (قدیم) اعتراضات جو آپ نے ایامِ جوانی میں سیکھے تھے طوطے کی طرح پڑھ سنائے۔ چنانچہ قادیانی ریویو بھی اس بات کا شاکی (شکایت کرنے والا) ہے اور کہتا ہے کہ

"پادری صاحب اندازِ بیان مختلف تھا اس لئے ضروری تھا کہ ان کے جواب میں بھی اسی انداز کو اختیار کیا جاتا۔ لیکن مولوی صاحب کا انداز وہی قدیم مناظرانہ ہے جس کے بیان میں کوئی ندرت (عمدگی، انوکھاپن) نہیں"۔

(فروری ۱۹۴۲ء صفحہ ۵۲)۔

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند

آنچہ استادِ ازل گفت ہماں میگوئم

واقعہ صلیبِ مسیح اور قرآن

لیکن اس سے قبل کہ ہم مولوی صاحب کے اعتراضات کا جواب دیں ہم مولوی صاحب سے ایک سوال پوچھنا چاہتے ہیں جس کے جواب پر ان کے اپنے دین وایمان کا مدار ہے۔ آپ نے بالکل سچ فرمایا ہے کہ

"دنیا کی تاریخی کتب اور مسیحی اناجیل بالاتفاق شہادت دیتی ہیں کہ یہود مسیح کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتے رہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے آپ کے سر پر کانٹوں کا تاج رکھ کر آپ کو صلیب پر چڑھادیا"

(اسلام اور مسیحیت صفحہ ۱۳۱)۔

یہ الفاظ ثابت کرتے ہیں کہ آپ کو اس بات کا اقبال ہے کہ مسیح کا صلیب پر چڑھایا جانا ایک حقیقی اور سچا تاریخی واقعہ ہے کیونکہ بالفاظِ شما "دنیا کی تاریخی کتُب اور مسیحی اناجیل بالاتفاق شہادت دیتی ہیں" کہ یہ واقعہ کوئی من گھڑت افسانہ نہیں اور اس امر میں ان لوگوں کو جو واقعہ صلیب کے موقعہ پر حاضر تھے نہ تو قوتِ متخیلہ (خیال پیدا کرنے والی قوت، سوچنے کی قوت) نے فریب دیا تھا اور نہ کوئی شخص وہم اور شبہ میں گرفتار ہوا تھا۔ بلکہ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے جس کو ماننے والے گمان اور ظن (شبہ، بہتان، بدگمانی) کی پیروی نہیں کرتے بلکہ حق بات کہتے ہیں۔ لیکن قرآن "دنیا کی تاریخی" کتُب اور مسیحی اناجیل کی متفقہ شہادت" کے خلاف کہتا ہے "یہود کہتے ہیں کہ ہم نے عیسیٰ بن مریم رسول اللہ کو قتل کر دیا حالانکہ نہ اسے قتل کیا اور نہ

اسے صلیب دی۔ لیکن وہ شبہ میں پڑ گئے اور وہ جو اس کے بارے میں اختلاف رکھتے ہیں ان کی نسبت شک میں ہیں کہ ان کو اس کا علم نہیں لیکن وہ گمان کی پیروی کرتے ہیں اور یقیناً اس کو قتل نہیں بلکہ اسے خدا نے اپنی طرف اٹھالیا اور اللہ غالبِ حکمت والا ہے"۔(سورہ نساء آیت ۱۵۶)۔

پس قرآن "دنیا کی تاریخی اور مسیحی اناجیل کی متفقہ شہادت" کے عین ضد واقعہ صلیب کا انکار کرتا ہے۔ چونکہ علم منطق کے رو سے اجتماع الضدین محالات میں سے ہے۔ پس یا تو "دنیا کی تاریخی کتُب اور مسیحی اناجیل کی متفقہ شہادت سچی ہے یا قرآن کی شہادت سچی ہے۔ بصورت اول آپ قرآن اور اپنے ایمان کا انکار کریں گے اور بصورت دوم دنیا کی تاریخی کتُب کی شہادت کو کاذب (جھوٹا) سمجھیں گے۔

مصیبت میں پڑا ہے سینے والا چاک داماں کا

جو یہ ٹانکا تو وہ ادھڑا جو وہ ٹانکا تو یہ ادھڑا

دیکھیں مرحوم مولوی صاحب کے ہم خیال اصحاب کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اور کون سی راہِ فرار تجویز فرماتے ہیں۔

باب دوم

مولوی ثناء اللہ صاحب کے اعتراضات کی خامی

مولوی ثناء اللہ صاحب کی تفسیر

مرحوم مولوی صاحب آیت زیر بحث کو ابنِ اللہ سے منسوب کر کے اپنا خاص الخاص اعتراض اپنے مخصوص انداز میں بایں الفاظ کرتے ہیں:

مسیح کے اس مقولہ سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ الوہیت اور ذات مسیح میں لزوم کی نسبت نہ تھی۔ بلکہ ذاتِ الوہیت معاذ اللہ اس شعر کی مصداق تھی۔

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے

کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انسان سے

(اہلِ حدیث ۶ فروری ۱۹۴۲ء)

اس تمام مضمون کا اور مندرجہ بالا اعتراض کا جو بہ تکرار پیش کیا گیا ہے ماحصل یہ ہے کہ یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ خدا اور مسیح میں انفکاک (جدا ہونا) اور علیحدگی تھی۔ یعنی خدا مسیح سے جدا تھا اور اس نے مسیح کو ترک کر دیا تھا۔

مولوی صاحب کی اخفائے حق کی کوشش

ہمیں افسوس ہے کہ مولوی ثناء اللہ صاحب کا یہ اعتراض نہ صرف ان کی مناظرانہ حیثیت کو بٹہ (کمی) لگاتا ہے بلکہ اخلاقی پہلو سے بھی قابلِ گرفت ہے۔ آپ نے اپنی کتاب اور اپنے اخبار اہلِ حدیث کے مضمون میں جس جس جگہ زیر بحث آیت کا ذکر کیا ہے آپ نے اپنے ناظرین پر یہ ظاہر

کیا ہے۔ کہ یہ کلمہ (اے میرے خدا، اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟) ابن اللہ کا اپنا" مقولہ "ہے جو آپ کے مانی (مان کرنے والا) الضمیر کا اظہار کرتا ہے۔ حالانکہ یہ کلمہ آنخداوند کا اپنا مقولہ نہیں۔ بلکہ یہ آیت بائیسویں (۲۲) زبور کی پہلی آیت ہے جس کو آپ نے صلیب پر سے اس مزمور کا عبرانی زبان میں اقتباس کر کے تلاوت فرمایا۔ پس مولوی صاحب مرحوم اس مقام پر اخفائے حق (حق کو چھپانے) کے مُرتکب ہوئے ہیں اور یہ حرکت آپ سے سہواً صادر نہیں ہوئی بلکہ آپ نے دیدہ دانستہ (جان بوجھ کر) کی ہے کیونکہ:

اول۔ آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ صحفِ مقدسہ سے بخوبی واقف ہیں۔ لہٰذا آپ کو یہ ضرور معلوم ہو گا کہ جو کلمہ اس آیہ شریفہ میں ہے وہ ابنِ اللہ کا اپنا مقولہ نہیں بلکہ بائیسویں (۲۲) زبور کی پہلی آیت ہے۔

دوم۔ بفرضِ محال اگر آپ کو یہ علم نہیں تھا تو جس انجیل کے صفحہ پر سے آپ نے اس آیت کو نقل کیا تھا اس صفحہ کے حاشیہ نے آپ کو بتلا دیا ہو گا کہ یہ آیت محض ایک اقتباس ہے جو بائیسویں (۲۲) زبور کی پہلی آیت ہے۔

سوم۔ آپ کو انجیل جلیل کے متعلق ہمہ دانی کا دعویٰ ہے (کتاب اسلام اور مسیحیت صفحہ ۳۸)۔ پس آپ کم از کم اس امر سے (جس کو مسیحی کلیسیا کا بچہ بچہ جانتا ہے) ضرور واقف ہوں گے کہ ابنِ اللہ نے خدا کو مخاطب کرتے ہوئے کبھی خدا" یا اے میرے خدا" نہیں کہا۔ بلکہ آپ ہمیشہ خدا کو "ابا"۔ (مرقس ۱۴:۳۶)۔ "اے میرے باپ"، "میرا باپ"، "میرا آسمانی باپ"، (متی ۱۱:۲۵۔ مرقس ۱۳:۳۲، متی ۷:۲۱۔ ۱۰:۳۲۔ لوقا ۲:۴۹، متی ۱۶:۱۷، ۱۸:۱۰۔ متی ۱۸:۳۵ وغیرہ وغیرہ)۔ کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اپنی زندگی کی آخری رات آپ نے جو دعا مانگی اس میں بھی خدا کو" اے باپ" ہی کہا (یوحنا ۱۷: باب) بلکہ صلیب پر سے آپ نے جو سات کلمات اپنی مبارک زبان سے فرمائے ان میں سے پہلے اور آخری کلمے (جس کے بعد ہی آپ نے دم دے دیا) میں آپ نے خدا کو مخاطب کر کے "اے باپ" ہی کہا (لوقا ۲۳:۳۴)۔ پس مولوی صاحب نے انجیل متی میں ایلی ایلی لما شبقتنی "پڑھا تو آپ جیسے نکتہ رس (تیز فہم) شخص کیوں نہ چونک پڑے کہ اس خاص مقام میں سیدنا مسیح "ابا" کے بجائے "ایلی ایلی" کیوں کہتے ہیں؟ اگر آپ نے دریافت کرنے کی زحمت گوارا کی ہوتی تو آپ پر یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ مقولہ ابنِ اللہ کا نہیں بلکہ آپ زبور شریف کی آیت کی تلاوت فرما رہے تھے۔

سیدنا مسیح کے صلیب پر کے پہلے اور آخری کلمات کے الفاظ (لوقا ۲۳:۳۴، ۴۶) ہی ایسے چونکا دینے والے ہیں کہ ہر صاحبِ عقل پر یہ فوراً ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ مقولے سیدنا مسیح کے ہیں۔ لیکن آیہ زیر بحث اس قسم کی طبعیت رکھنے والے انسان کی روحانی حالت کی ترجمان نہیں ہو سکتی اور یہ کہ حضرت کلمتہ اللہ کا" مقولہ "نہیں بلکہ زبور کی آیت ہے جو آپ تلاوت فرما رہے تھے۔

چہارم۔ آپ جیسے انجیل دان سے یہ مخفی نہ ہو گا کہ ابنِ اللہ کی مادری زبان عبرانی نہیں بلکہ ارامی زبان تھی۔ (مرقس ۵:۴۱؛ ۷:۳۴، ۱۴:۳۶ وغیرہ) پس جب آپ نے انجیل متی میں پڑھا کہ ابنِ اللہ نے صلیب پر سے عبرانی زبان میں ایک کلمہ فرمایا تو اگر آپ نے وجہ دریافت کی ہوتی تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ جس طرح ہندوستان کا کوئی مومن مسلمان حالتِ نزع میں قرآنی سورہ یسٰین کی آیات عربی زبان میں تلاوت کرتا ہے اسی طرح ابن اللہ نے بھی جانکنی کی حالت میں بائیسویں (۲۲) زبور کی پہلی آیت زبور شریف کی اصل زبان عبرانی میں تلاوت فرمائی تھی۔

پنجم۔ ممکن ہے کہ باوجود دعویٰ ہمہ دانی (صفحہ ۳۸) آپ یہ عذر لنگ پیش کریں کہ آپ کو یہ علم ہی نہ تھا کہ ابن اللہ کی مادری زبان آرامی تھی، لیکن آپ کو کم از کم زبان عربی کی تاریخ اور اسلامی تاریخ سے تو واقفیت تھی۔ کیونکہ آپ بڑے مولوی اور "مولوی فاضل" بھی تھے۔ آپ کی کتاب نے تو یہ ظاہر کر دیا کہ مسیحی کلیسیا کی تاریخ کے متعلق آپ کے ماخذ صرف بچوں کے ابتدائی مدارج کی کتُب ہی ہیں (صفحہ ۴۵، ۴۶) لیکن عربی دانی کا تو یہ حال نہیں ہونا چاہیے تھا کہ ارض مقدس میں عربی زبان کی آمد سے پہلے ارامی زبان رائج تھی جس کی جگہ عربی نے لے لی تھی۔

یہ زبان بابل کی زبان تھی جو کنعان میں اہلِ یہود کے ساتھ آئی تھی۔ اہلِ یہود کی کتُبِ مقدسہ کے تراجم اور تفاسیر جن کو "تارگم" کہتے ہیں۔ اسی زبان میں منجی عالمین کی بعثت (رسالت) سے ایک صدی پہلے اور ایک صدی بعد کے دوران لکھے گئے تھے۔ یہی زبان حضرت کلمتہ اللہ اور آپ کے رسولوں کی مادری زبان تھی۔ دسویں صدی مسیحی تک اہل یہود اسی زبان میں کتابیں لکھا کرتے تھے۔ یہ زبان تمام پار تھی سلطنت میں بولی جاتی تھی جس کی حدود دریائے سندھ سے دریائے فرات تک اور بحر ہند سے بحر کیسپین اور کوہ ہندو کش تک تھیں۔ یہ زبان اس قدر وسیع رقبہ اور دور دراز کے ممالک میں بولی جاتی تھیں کہ مورخ یوسیفس نے اپنی کتاب پہلے ارامی زبان میں تصنیف کی تھی تاکہ "بابل کے ملک کے رہنے والے اور عرب کے دور افتادہ باشندے اور فرات کے پار رہنے والے یہودی اور پار تھی" اس کی کتاب کو پڑھ سکیں۔ بعد میں یوسیفس نے اس کتاب کو یونانی زبان میں "ان لوگوں کی خاطر جو رومی سلطنت میں رہتے ہیں" ترجمہ کیا تھا[1]۔

عرب کی فتوحات سے ایک ہزار سال پہلے مشرق میں یہی ارامی زبان مہذب دنیا کی زبان سمجھی جاتی تھی۔ حتیٰ کے ایران جیسے دور دراز ملک میں بھی ایرانی زبان کی بجائے ارامی زبان ہی تصنیف و تالیف کا ذریعہ تھی۔ لیکن اسلامی فتوحات نے یہ نقشہ بدل دیا اور عربی نے ارامی زبان پر غلبہ حاصل کر لیا۔ پس آپ کو اس بات سے ناواقف نہیں ہونا چاہیے تھا کہ ابن اللہ کی مادری زبان ارامی تھی اور عبرانی فقرہ جو آپ کی زبان مبارک سے نکلا وہ زبور شریف کی اصل زبان عبرانی کا اقتباس تھا۔

وجوہِ بالا (اوپر بیان کی گئی وجوہات) کی بناء پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ اخفائے حق کے عمداً مُرتکب ہوئے ہیں۔ کیونکہ گو آپ کو خود معلوم تھا کہ یہ عبرانی کلمہ بائیسویں (۲۲) زبور کا حصہ ہے۔ لیکن آپ نے ہر جگہ اپنے ناظرین پر یہی ظاہر کیا ہے کہ کلمہ خود ابن اللہ کا اپنا "مقولہ" ہے جو ان کے خیالات و جذبات کا مظہر ہے اور یوں آپ نے لوگوں کو دیدہ و دانستہ گمراہ کیا۔ ہر صحیح العقل شخص ایک قائل کے اپنے قول اور کسی دوسرے کے کلام میں جس کا اس نے اقتباس کیا ہو تمیز کر سکتا ہے اور اپنی روز مرہ کی زندگی میں تمیز کرتا ہے۔ مثلاً اگر زید کسی کو بتلائے کہ بکر نے حالتِ نزع میں سورہ یٰسین کی آیت پڑھی **إِنَّا جَعَلْنَا فِي أَعْنَاقِهِمْ أَغْلَالًا فَهِيَ إِلَى الْأَذْقَانِ فَهُم مُّقْمَحُونَ** ترجمہ: یعنی ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں اور وہ ٹھوڑیوں تک پھنسے ہوئے ہیں تو ان کے سر افل کر رہ گئے ہیں" (سورہ یٰسین ۷ ترجمہ نذیر احمد) تو کوئی عقل اور سمجھ رکھنے والا شخص اس عربی کلام کو بکر سے منسوب کر کے نہیں کہے گا کہ یہ کلام بکر کا اپنا کلام ہے۔ بلکہ ہر شخص جس کے سر میں دماغ اور دماغ میں عقل ہے یہی کہے گا کہ یہ عربی کلام قرآنی آیت ہے جس کو بکر بحالتِ نزع تلاوت کر رہا تھا۔ ایک اور مثال سے ہم اس امر کو واضح کر دیتے ہیں۔ قریش قرآن جو جھٹلا کر کہتے تھے کہ قرآن "پریشان خوابوں کا مجموعہ" ہے (انبیاء ۵ آیت) اور وہ "پہلے لوگوں کی کہانیاں" ہے۔ تب حضرت نے بارگاہ الہیٰ میں فریاد

[1] See Max Muller, Lectures on the Science of Language Vol.1 Lecture 8 and Josephus, Wars of the Jews.

کر کے کہا تھا۔ "یا اللہ میری قوم نے قرآن کو ٹھہرایا جھک جھک" (فرقان آیت ۳۲) اب معترض کی سی عقل کے مالک ہی یہ کہیں گے کہ رسول عربی کا یہ مقولہ ہے کہ قرآن محض جھک جھک (تکرار، بک بک) ہے۔ لیکن ہر صاحبِ ہوش یہی کہے گا کہ

ع بریں عقل و دانش بباید گریست

پس آپ نے اپنے مفروضہ (کہ آیت زیر بحث ابن اللہ کا اپنا مقولہ ہے) کی بناء پر جو منطقیانہ استدلال کی عمارت کھڑی کی ہے (اسلام اور مسیحیت صفحہ ۶۸۔ اہل حدیث بابت ۶ فروری ۱۹۴۲ء صفحہ ۳، ۴ وغیرہ) وہ از سر تا پا بے بنیاد ہے۔ معترض سے تو یہودی ربی کلاسنر (Klaussner) ہی اچھے رہے جو اپنی ضیغم کتاب "یسوع ناصری" میں اس کلمہ کی نسبت فرماتے ہیں کہ "یسوع صحفِ مقدسہ کی روح سے اس قدر معمور تھا کہ اس نے صلیب پر اپنی جان دیتے وقت بھی کتابِ مقدس کی آیت کی تلاوت کی" (Jesus of Nazareth) کاش کہ معترض ان یہود ہی سے جن کو قرآن "ناحلف" اور "قسی القلب" وغیرہ کہتا ہے۔ حق اور صداقت کا سبق سیکھ لیتے۔ مرحوم ڈاکٹر اقبال ایسے مومن مسلمان کی نسبت ہی فرما گئے ہیں۔

ع یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کر شرمائیں یہود

کاش کہ مرحوم مولوی صاحب اخفائے حق سے یہ کام نہ لیتے اور جیتے جی خود اپنے فتویٰ کو یاد رکھتے کہ "مذہبی مناظرات میں جو خدا کی عدالت میں پیش ہوتے ہیں واقعات صحیحہ کا اخفا کسی طرح جائز نہیں ہے"۔ صفحہ ۱۲ اور کہ منصف مزاج لوگ مذہبی مباحثات میں خاص کر اخفائے واقعات کرنا جرُم عظیم سمجھتے ہیں (صفحہ ۲۳) آپ نے اخفائے واقعات سے "کام لے کر ایک "جرم عظیم" کا ارتکاب کیا۔

مولوی صاحب کی تفسیر صحیح اُصول کے خلاف

مرحوم مولوی صاحب کو تفسیر نویسی پر ناز تھا۔ اسی لئے بچارے خلیفہ قادیان کو آئے دن تفسیر نویسی کے لئے چیلنج بھی دیا کرتے تھے۔ آپ نے ایک رسالہ "تفسیر بالرائے" لکھ کر اپنے مخالف "قادیانیوں، شیعوں، لاہوری مرزائیوں، نیچری مسلمانوں" وغیرہ کو اُصولِ تفسیر کی تعلیم بھی دی ہے۔ پس ہمیں تعجب آتا ہے کہ انجیل جلیل کی آیات کی تفسیر کرتے وقت انہوں نے صحیح اُصولِ تفسیر کو پسِ پشت کیوں پھینک دیا؟

صحیح تفسیر کے لئے لازم ہے کہ (۱) کہ وہ کتاب اللہ کی آیات بینات کے خلاف نہ ہو اور کہ (۲) وہ قائل کے اصل مفہوم اور حقیقی منشا کے خلاف نہ ہو اور اس کے خیالات، جذبات اور افعال کے منافی نہ ہو۔ ورنہ وہ تفسیر القول بمالا یرضیٰ قائلہ متصور ہو گی۔ اس کے برعکس لازم ہے کہ صحیح تاویل کہنے والے کے خیالات کا آئینہ ہو اور اس کے جذبات کی درست ترجمانی کرے اور اس کے اقوال وافعال کے مطابق ہو اور (۳) کتاب اللہ کی آیات اس تاویل کی مصدق ہوں۔

اگر مرحوم کی زیر بحث آیت کی تاویل درست ہے تو لازم تھا کہ وہ یہ ثابت کرتے کہ ان کی تاویل حضرت کلمتہ اللہ کے اصلی مفہوم اور حقیقی منشاء اور مافی الضمیر کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔ (۲) کہ ابنِ اللہ کے خیالات، جذبات، اقوال وافعال جو اناجیل اربعہ میں پائے جاتے ہیں (بالخصوص وہ جن کا تعلق خداوند کی زندگی کے آخری ہفتہ کے ساتھ ہے) سب یہ ظاہر کرتے ہیں کہ خدا نے مسیح کو ترک کر دیا تھا اور (۳) انجیل جلیل کی آیات اس بات کی بین شاہد ہیں کہ خدا مسیح سے جُدا تھا۔ کیونکہ اس نے آپ کو معاذ اللہ رد کر دیا تھا۔ اگر وہ یہ ثابت کر سکتے تو ہم بھی مان لیتے کہ تفسیر نویسی میں آپ بال کی کھال اتارنے والے ہیں" (صفحہ ۵۱) لیکن انجیل کی آیات بینات اور کلمتہ اللہ کے کلماتِ طیبات سے تو معترضین تا قیامت یہ ثابت نہیں کر سکتے۔

فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ۔ پس اگر یہ نہ کر سکو اور ہر گز نہ کر سکو گے تو دوزخ کی آگ سے ڈرو جس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے اور وہ منکروں کے لئے تیار ہے (بقرہ آیت ۲۳)۔

مولوی ثناء اللہ صاحب کی تفسیر اناجیل کے نقیض ہے

اناجیل اربعہ کا ایک ایک صفحہ اور ابن اللہ کی مبارک زندگی کا ایک ایک ورق مولوی صاحب مرحوم کی تفسیر کو غلط ثابت کرتا ہے۔ چاروں انجیلوں کی ایک ایک آیت کی "بال کی کھال اتار" لو۔ حضرت کلمتہ اللہ کے ارشادات اور کلمات طیبات کو ایک ایک کر کے چھان مارو۔ آپ کے خیالات جذبات اور افعال کو ایک ایک کر کے دیکھ لو تم کو کسی مقام پر یہ نہ ملیگا کہ خدا نے ابن اللہ کو ترک کر دیا تھا۔ اس کے برعکس انجیل جلیل کی آیات بینات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اَب اَور اِبن میں "انفکاک (الگ ہونا) اور جدائی" اور مغائرت (بے گانگی، اجنبیت) کا نام ونشان بھی نہیں۔ اس کے برعکس ہر وقت اور ہر جگہ کامل اتصال رفاقت قُربت اور اتحاد نظر آتا ہے۔

سیدنا مسیح کے اقوال

کسی نے خوب کہا ہے کہ من آنم کہ من دانم۔ اس معیار سے جب ہم ابن اللہ کے اقوال پر نظر کرتے ہیں تو ہم کو یہی دکھائی دیتا ہے کہ خدا میں اور آپ میں رفاقت، قُربت، اتحاد اور محبت کا رشتہ شروع سے آخری دم تک ہمیشہ قائم رہا۔ چنانچہ ابن اللہ فرماتے ہیں کہ باپ بیٹے سے محبت کرتا ہے۔ اور اس کی عزت کرتا ہے۔ (یوحنا۳:۳۵، ۱۴:۲۱، ۵:۲۰، ۸:۵۴، ۱۰:۱۷، ۱۵:۱۹، ۱۷:۲۶) اور "بیٹا باپ سے محبت کرتا ہے"۔ (یوحنا۱۵:۱۰) "جو کچھ میرا ہے وہ باپ کا ہے۔ اور وہ سب میرا ہے" (یوحنا۱۶:۱۵، ۱۷:۱۰)۔ "میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا ہے اور کوئی بیٹے کو نہیں جانتا سوا باپ کے اور کوئی باپ کو نہیں جانتا سوا بیٹے کہ اور اس کے جس پر بیٹا ظاہر کرنا چاہے" (متی ۱۱:۲۷، لوقا ۱۰:۲۲۔ یوحنا ۸:۵۵، ۱۰:۱۵)۔ آنخداوند فرماتے ہیں کہ "جس نے مجھے دیکھا اس نے باپ کو دیکھا۔" (یوحنا ۱۴:۹) کیونکہ "میں اور باپ ایک ہیں" (یوحنا ۱۰:۳۰)۔ آپ نے فرمایا کہ باپ کی رفاقت اور اس کے کام کو پورا کرنا آپ کا "کھانا پینا" ہے (یوحنا ۴:۳۲، ۵:۳۰۔ ۶:۳۸) اور کہ آپ خدا کی طرف سے آئے ہیں اور خدا کے پاس واپس لوٹ جائیں گے (یوحنا ۷:۲۹، ۷:۳۳۔ ۸:۲۳۔ ۱۶:۲۸۔ ۲۰:۱۷ وغیرہ)۔ کیا یہ الفاظ (جن میں اکثر آپ نے اپنی زندگی کے آخری ہفتہ میں بلکہ آخری رات فرمائے تھے) کسی ایسے شخص کی زبان سے نکل سکتے ہیں جس کو یہ خیال ہو کہ خدا اس سے ناراض ہے یا وہ مغضوبِ (جس پر غصہ ہو) قہر الٰہی ہے یا کہ خدا نے اس کو ترک کر دیا ہے؟

اللہ تعالیٰ کی شہادت

اگر مولوی ثناء اللہ صاحب کے خیال میں ابن اللہ کے مندرجہ بالا کلمات ان کی تاویل کو مردہ ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں تو وہ چونکہ قال اللہ اور اطیعوا اللہ کے ماننے والے ہیں اور اتمام حجت کی خاطر ان کی پاس خاطر ہمیں منظور ہے لہذا ہم ان کو بتلاتے ہیں کہ خود ارشادِ خداوندی ثابت کرتا ہے کہ خدا نے ابنِ اللہ کو تمام عمر کبھی ترک نہیں کیا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس خدا نے "بنائے عالم سے پیشتر بیٹے سے محبت رکھی" (یوحنا ۱۷:۲۴) جب کلمتہ اللہ مبعوث ہوئے تو الہیٰ ارشاد ہوا"۔ یہ میرا پیارا بیٹا ہے جس سے میں خوش ہوں" (متی ۳:۱۷) اس آیہ شریفہ کی بہترین تفسیر (یسعیاہ ۴۲: ۱۔۴) میں ہے۔ صلیبی واقعہ سے چند ہفتے پہلے پھر الٰہی ارشاد ہوتا ہے "یہ میرا پیارا بیٹا ہے جس سے میں خوش ہوں۔ اس کی سنو" (متی ۱۷:۵) صلیب

دیئے جانے سے چند ساعت پہلے ابنِ اللہ نے کہا "اب میری جان گھبراتی ہے پس میں کیا کہوں؟ اے باپ! مجھے اس گھڑی سے بچا؟ لیکن میں تو اسی سبب سے اس گھڑی کو پہنچا ہوں۔ اے باپ! اپنے نام کو جلال دے۔ پس آسمان سے آواز آئی کہ میں نے اس کو جلال دیا ہے اور پھر بھی دوں گا" (یوحنا ۱۲: ۲۷تا۲۸)۔ جن شاگردوں نے ان الٰہی کلمات کو سنا وہ شہادت دیتے ہیں کہ دوسروں کے ساتھ انہوں نے خدا کی یہ گواہی سنی تھی (۲۔پطرس ۱: ۱۷)۔ اور مقدس یوحنا کہتا ہے کہ "خدا کی گواہی یہ ہے کہ اس نے اپنے بیٹے کے حق میں گواہی دی ہے" (یوحنا ۵: ۹) خود ابنِ اللہ فرماتا ہے کہ "باپ جس نے مجھے بھیجا ہے اسی نے میری گواہی دی ہے" (یوحنا ۵: ۳۷) مولوی صاحب۔ خدا سے بڑا تو کوئی گواہ نہیں ہے اور خدا کی گواہی آپ کی تاویل کو (کہ اس نے ابنِ اللہ کو ترک کر دیا تھا) مردود قرار دیتی ہے۔

ابنِ اللہ کا طرزِ عمل

ابنِ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ کی آمد کا واحد مقصد یہ ہے کہ آپ نے اپنے باپ کی مرضی کو پورا کریں اور اس کا کام سرانجام دیں جو باپ نے آپ کے سپرد کیا ہے۔ (یوحنا ۴: ۳۴، ۵: ۳۰۔ ۶: ۳۸، ۱۲: ۴۹۔ ۱۵: ۱۰۔ مرقس ۱۴: ۳۶۔ متی ۲۶: ۳۹تا۴۲۔ لوقا ۲۲: ۴۲)۔ آپ ہمیشہ اسی کام کو سر انجام دینے کی دھن میں رہتے تھے (یوحنا ۴: ۳۲تا۳۴، ۹: ۴۔ ۱۴: ۳۱) اور اس کو پورا کرنے پر تلے تھے اور اس کی تکمیل میں کسی قسم کے خطرے کی پرواہ نہیں کرتے تھے (لوقا ۹: ۵۱۔ ۱۲: ۵۰) یہاں تک کہ آپ نے اس کام کو پورا کر کے چھوڑا (یوحنا ۷: ۲۱۔ ۸: ۲۹۔ ۹: ۴۔ ۱۷: ۴۔ ۱۹: ۳۰) ابن اللہ کو خوب معلوم تھا کہ اس کو سرانجام دینے کی راہ میں اہل یہود کی روز افزوں بے ایمانی اور برگشتگی کی وجہ سے آپ کو انواع واقسام کی دقتوں اور دشواریوں کا جان توڑ مقابلہ کرنا ہو گا۔ آپ کے تجربہ نے آپ کو بتلایا دیا تھا کیا آپ کی قوم کے قائدوں اور سردار کاہنوں کی خصومت دن بدن ترقی کر رہی ہے۔ آپ نے انبیائے سلف اور اپنے ہم عصر نبی یوحنا بپتسمہ دینے والے کے انجام میں (متی ۲۳: ۲۹۔ ۲۳: ۳۷۔ ۲۱: ۳۲۔ وغیرہ) دیکھ لیا تھا کہ آپ کا اپنا حشر کیا ہو گا (متی ۱۷: ۱۲تا۱۳) صحفِ مقدسہ کے مطالعہ سے (جیسا ہم اپنی کتاب "کلمتہ اللہ کی تعلیم" میں لکھ چکے ہیں) کلمتہ اللہ کو یقین ہو گیا تھا کہ یسعیاہ نبی کے صحیفہ کے "خادمِ یہوواہ" کے تصور کے مصداق آپ ہی ہیں (لوقا ۲۲: ۳۷۔ ۴: ۲۱) لیکن یہ سب باتیں آپ کے پہاڑ جیسے زبردست اور مصمم ارادہ کو نہ بدل سکیں اور آپ نے یہ ٹھان لی کہ ہر چہ باداباد آپ اس کام کو پورا کر کے چھوڑیں گے جس کے واسطے باپ نے آپ کو دنیا میں بھیجا تھا (متی ۲۰: ۲۸۔ مرقس ۱۰: ۴۵) خواہ ایسا کرنے میں آپ کو اپنی جانِ عزیز بھی قربان کرنی پڑے (یوحنا ۱۰ باب) پس آپ نے اپنی اذیت اور مصلوب ہونے کی بابت اپنے شاگردوں کو اطلاع دی (متی ۱۶: ۲۱۔ ۱۷: ۹، ۲۱، ۲۲، ۲۳و۴۰۔ ۲۰: ۱۹۔ ۲۶: ۲، ۱۲، ۱۳، ۳۲۔ مرقس ۹: ۸تا۱۳، ۳۱۔ ۱۰: ۳۳، ۳۴۔ ۱۴: ۲۴، ۶۲۔ ۱۵: ۱۶تا۲۰۔ لوقا ۹: ۲۲، ۴۴۔ ۱۲: ۵۰۔ ۱۳: ۳۲۔ ۱۷: ۲۵۔ ۱۸: ۳۱تا۳۴ ۲۲: ۶۳تا۶۶۔ ۲۳: ۱تا۳۳۔ ۲۴: ۲۱۔ یوحنا ۱۰: ۱۵تا۱۸۔ ۱۶: ۱۶۔ ۲۰: ۹ وغیرہ) اس کے ساتھ ہی ابنِ اللہ نے اپنے شاگردوں کو یہ بھی بتلا دیا کہ اہلِ یہود آپ کی خاطر ان کو بھی طرح طرح کی ایذائیں پہنچائیں گے اور ان کو قتل کریں گے (متی ۲۴: ۹تا۱۳۔ ۵: ۱۰تا۱۱۔ ۱۰: ۱۶تا۳۲۔ ۲۳: ۳۴تا۳۶۔ ۲۴: ۸تا۱۲، مرقس ۱۳: ۹، ۱۲، ۱۳۔ لوقا ۱۰: ۳۔ ۱۱: ۴۹۔ ۱۷: ۲۵۔ ۲۱: ۱۲، ۱۶، ۱۷۔ یوحنا ۱۵: ۲۰، ۲۱۔ ۱۶: ۲تا۴ وغیرہ)۔ لیکن جس طرح قرآن اور دورِ حاضرہ کے مسلمان یہ بات گوارہ نہیں کر سکتے کہ خدا کا پیارا نبی مقتول و مصلوب ہو اور کہتے ہیں کہ **وما قتلوہ وما صلبو** اسی طرح شاگرد بھی یہ بات گوارا نہ کر سکے اور اُن میں سے ایک نے کہا۔ "اے خداوند، خدا نہ کرے۔ یہ تجھ پر ہرگز نہیں ہونے کا"۔ پر ابن اللہ نے اسے سمجھایا کہ صلیب کی راہ درحقیقت حدا کی راہ ہے اور فرمایا کہ "تو خدا کی باتوں کا نہیں بلکہ آدمیوں کی باتوں کا خیال رکھتا ہے"۔ اور علی الاعلان فرمایا "اگر کوئی میرے پیچھے آنا چاہے تو اپنی خودی انکار کرے اور اپنی صلیب اٹھائے

اور میرے پیچھے ہولے کیونکہ جو کوئی اپنی جان بچانی چاہے وہ اسے کھوئے گا اور جو کوئی میرے واسطے اپنی جان کھوئے گا وہ اسے پائے گا۔وہ وقت آ گیا ہے کہ ابن آدم جلال پائے میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ جب تک گیہوں کا دانہ زمین پر گر کے مر نہیں جاتا وہ اکیلا رہتا ہے لیکن جب مر جاتا ہے تو بہت سا پھل لاتا ہے۔ابن آدم کا اونچے پر چڑھایا جانا ضرور ہے اور جب میں اونچے پر چڑھایا جاؤں گا۔تو سب کو اپنے پاس کھینچوں گا"۔(متی ۱۶: ۱۲تا۲۷۔ یوحنا۱۲: ۲۳و۲۴۔ ۳۲تا۳۴) آپ نے شاگردوں کو خبر دار کر کے فرمایا"لوگ تم کو ایذا دینے کے لئے پکڑوائیں گے اور تم کو قتل کریں گے۔مگر جو آخر تک برداشت کرے گا وہی نجات پائے گا"(متی ۲۴: ۸تا۱۲)۔

مولوی صاحب کو یہ خیال نہ آیا کہ جو شخص اپنے شاگردوں کو"مرتے دم تک وفادار"رہنے کی تلقین کرتا ہے(متی ۱۰: ۲۲)وہ خود بھی"آخر تک برداشت"کریگا۔کلمتہ اللہ نے اپنے حواریوں کو فرمایا تھا کہ ایذا اور مصیبت کے وقت وہ خدا پر بھروسہ رکھیں۔(متی ۱۰: ۱۹و۲۹۔ مرقس ۱۳: ۱۱) اور ایذا پہنچانے والوں کے لئے دعائے خیر کریں(متی ۵: ۴۴) آپ نے کیوں نہ سوچا کہ جو شخص اپنی تعلیم پر چل کر صلیب پر سے اپنے دشمنوں کے لئے دعائے مغفرت مانگتا ہے وہ خود اسی صلیب پر ضرور خدا پر بھروسہ رکھے گا؟وہ جو دوسروں کو کہتا ہے"خاطر جمع رکھو میں دنیا پر غالب آیا ہوں۔میں اپنا اطمینان تم کو دیتا ہوں"(یوحنا۱۶: ۳۳) خود قلبی اطمینان سے کس طرح محروم ہو سکتا ہے؟ناظرین ہی انصاف سے بتلائیں کہ حضرت ابنِ اللہ باپ کی رفاقت اور اطمینان پائے بغیر کس طرح ایسے کلمات اپنے منہ سے نکال سکتے ہیں؟اگر خدا نے مسیح کو ترک کر دیا ہوتا تو وہ کس طرح خود مطمئن ہو کر ایسے تسلی بخش کلمے فرما سکتے ہیں؟ناظرین نے حضرت ایوب کا نام ضرور سنا ہو گا۔جب اس پر مصائب وآلام کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تو وہ خدا سے بحث کرتا ہے اور خدا کو موردِ الزام گردان کر اس کو اپنا دشمن اور اپنے آپ کو بے گناہ قرار دیتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ خدا جانتا ہے کہ میں بے گناہوں تاہم وہ بے انصافی سے مجھ کو ترک کرتا ہے اور خواہ مخواہ مجھ کو مجرم قرار دینے پر تلا ہے۔ایوب کہتا ہے کہ خدا گویا صُم بکم(گونگا بہرہ)"۔آسمان پر بیٹھا ہے نہ سنتا ہے نہ جواب دیتا ہے اور نہ میری واویلا کی پرواکرتا ہے۔ناظرین خدارا انصاف سے کہنا کیا آپ کو مسیح مصلوب کا وطیرہ ایوب کا سا نظر آتا ہے؟کیا صلیب پر ابنِ اللہ کے کسی قول یا فعل سے کسی صاحب ہوش کے دماغ میں یہ خیال بھی آ سکتا ہے کہ منجی عالمین کا ایمان آخری وقت میں ایک لمحہ یا لمحہ کے کسی حصہ کے لئے بھی متزلزل ہو گیا تھا؟

مولانا نے ذرا غور وفکر کر کے یہ خیال تو کیا ہوتا کہ ہر قسم کی اذیت، مصیبت اور عذاب کو صبر اور محبت کے ساتھ برداشت کر لینے کے بعد جب ان تمام مصائب عقوبت(دُکھ)اور عذاب کا خاتمہ ہونے والا تھا تو کیا دم واپسیں(آخر کار)مسیح مصلوب کا ایمان متزلزل ہو سکتا تھا؟کیا ایسے وقت یاس اور نا اُمیدی ابنِ اللہ پر اس قدر غالب آسکتی تھی کہ وہ خیال کرتے کہ خدا نے ان کو ترک کر دیا ہے؟ان کی تو یہ تعلیم تھی کہ"خدا پر ایمان رکھو" (مرقس ۱۱: ۲۲) اور وہ اپنے اسی ایمان کے باعث مصلوب بھی کئے گئے تھے تو کیا خدا ایسے ایمان دار کو چھوڑ سکتا تھا؟کیا خدا کا وطیرہ ہے کہ وہ اپنے ایماندار بندوں کو عین ان کی حاجت کے وقت ترک کر دیا کرتا ہے اور وہ بھی ایسے ایمان دار کو جو کروڑوں کے"ایمان کا بانی اور کامل کرنے والا"ہو۔ (عبرانیوں ۱۲: ۲) ایسے ایمان دار کا ایمان کس طرح متزلزل ہو سکتا تھا؟فرانسیسی عالم ڈاکٹر ایلفرڈ لوازی(جو راسخ الاعتقاد مسیحی نہیں تھا)ان الفاظ کی نسبت کہتا ہے[1]

[1] Loisy, Le Evangiles Synoptiques.

"یہ الفاظ خدا سے دُوری اور نا اُمیدی کو ظاہر نہیں کرتے۔ یہ ایک راستباز شخص کو چیخ وپکار ہے جو درد و کرب میں مبتلا ہے لیکن اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ خدائے قدوس کی محبت اور حفاظت موت میں بھی اس کو چاروں طرف گھیرے ہوئے ہے"۔

ڈاکٹر ونسنٹ ٹیلر کے الفاظ

"یہ[1] نظریہ کہ خدا نے یسوع کو چھوڑ دیا تھا۔ اب اس قابل نہیں رہا کہ اس کا ذکر بھی کیا جائے"۔

جرمن عالم ڈبیلس کہتا ہے کہ

"اس فقرہ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ خدا نے مسیح کو چھوڑ دیا تھا یا مسیح کو ایسا معلوم دیتا تھا کہ خدا نے اس کو چھوڑ دیا ہے بلکہ حق تو یہ ہے کہ کوئی بھی دیندار یہودی مرتے دم اس آیت کو پڑھتے وقت یہ خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا تھا کہ خدا نے اس کو چھوڑ دیا[2] ہے"۔

ناظرین۔ للاللہ، ذرا انصاف کریں۔ کیا خدا کا انصاف اس بات کا متقاضی ہو سکتا تھا کہ وہ ابن اللہ کے ساتھ ایسا سلوک کرے جو وہ انجیل جلیل کے مطابق بدترین گنہگاروں سے بھی نہیں کرنا چاہتا (یوحنا ۳:۱۶۔ لوقا ۱۵:۷)؟ خدا کی محبت کس طرح اس بات کی متقاضی ہو سکتی تھی کہ وہ ایسے تاریک وقت میں اپنی روشنی کو اس سے باز رکھتی؟ منجی عالمین گناہ اور شیطان پر غالب آئے لیکن آپ نے آخری دم ان سے شکست کھا کر فتح حاصل نہیں کی تھی۔ اس کے برعکس دم واپسیں کے وقت بھی خدا کی حضوری اور قربت کے احساس کی وجہ سے آپ شیطان پر موت کی تلخی کے وقت غالب آئے اور آپ نے آسمان کی بادشاہت سارے مومنین کے لئے کھول دی۔

انجیل جلیل سے یہ ثابت ہے کہ ابن اللہ نے مصلوب ہونے سے پیشتر ایک ایک باقی پیش گوئی کے طور پر پہلے سے اپنے شاگردوں کو خبر دی تھی۔ چنانچہ اس مخبر صادق نے فرمایا تھا "تم سب اسی رات میری بابت ٹھوکر کھاؤ گے۔ لیکن میں اپنے جی اٹھنے کے بعد تم سے پہلے گلیل کو جاؤں گا" اور مقدس پطرس کو مخاطب کر کے فرمایا تھا "اسی رات مرُغ کے بانگ دینے سے پہلے تو تین بار میرا انکار کرے گا"۔ تم میں سے ایک جو میرے ساتھ کھانا کھاتا ہے مجھے پکڑوائے گا"۔ دیکھو ہم یروشلیم کو جاتے ہیں اور ابنِ آدم سردار کاہنوں اور فقیہوں کے حوالے کیا جائے گا اور وہ اس کے قتل کا حکم دیں گے اور اسے غیر قوموں کے حوالے کریں گے اور وہ اسے ٹھٹھوں میں اڑائیں گے اور اس پر تھوکیں گے اور اسے کوڑے ماریں گے اور قتل کریں گے اور تین دن کے بعد وہ جی اٹھے گا"۔ (مرقس ۱۰ باب۔ متی ۲۰ باب وغیرہ) لیکن آپ نے ان کو یہ خبر کبھی نہ دی کہ خدا باپ بھی مجھے ترک کر دے گا۔ انجیل جلیل کے کسی لفظ سے ہم کو یہ پتہ نہیں مل سکتا کہ خداوند کے نزدیک کبھی یہ خیال بھی پھٹکا (لمحہ) ہو کہ خدا آپ کو چھوڑ دے گا۔ اس کے برعکس گتسمنی باغ میں جانکنی (نزع کی حالت، اذیت) کی حالت کا ایک ایک لفظ یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ کو کامل یقین تھا کہ خدا کی قربت اکمل طور پر اس عذاب کے وقت آپ کا ساتھ دے گی۔

---

[1] Life and Ministry Of Jesus p.143 in Vol .7 of the Interpreter's Bible.

[2] Dibelius. From Tradition to Gospel pp.193 -194

ناظرین آپ کوہِ کلوری پر نگاہ کریں اور تینوں مصلوبوں کو دیکھیں۔ کیا آپ کو تینوں کے تینوں مصلوب خدا کے رد کئے ہوئے نظر آتے ہیں؟ کیا مسیح مصلوب کا وطیرہ وہی ہے جو باقی دو ڈاکوؤں کا ہے؟ یہ ڈاکو تو مانتے ہیں کہ وہ "اپنے کاموں کا بدلہ پا رہے ہیں اور ان کی سزا واجبی ہے" (لوقا ۲۳:۴۱) کیا معترض ابنِ اللہ کی دشمنی میں ان ڈاکوؤں سے بھی زیادہ قسی القلب (سنگدل) ہو گئے ہیں۔ ان میں سے ایک ڈاکو تائب ہوا تو ابنِ اللہ نے فرمایا" آج ہی تو میرے ساتھ فردوس میں ہو گا" (لوقا ۲۳: ۴۳)۔ کیا ایک شخص جو خود خدا کی رفاقت سے جدا ہو چکا ہو دمِ واپسیں کسی دوسرے گنہگار کے گناہ معاف کر کے اس کو اسی روز اپنے ساتھ جنت میں داخل ہونے کی بشارت دے سکتا ہے؟

سچ تو یہ ہے کہ خدا کی پدرانہ محبت ابنِ اللہ کی تمام زندگی بھر آپ کا واحد سہارا تھی۔ آپ کو اس لازوال ابدی محبت کا احساس اس قدر تھا کہ دنیا کی کوئی آفت آپ کے جیتے جی اس کو محو نہ کر سکی بلکہ صلیب پر سے آپ نے آخری لفظ جو اپنی زبانِ مبارک سے بیان فرمائے یہ تھے"۔ اے باپ! میں اپنی روح تیرے ہاتھوں میں سونپتا ہوں اور یہ کہہ کر دم دے دیا" (لوقا ۲۳:۴۲)۔ معترض نے کچھ تو غور کیا ہوتا۔ کیا یہ الفاظ مرتے دم کسی ایسے شخص کے منہ سے نکل سکتے ہیں جس کو یہ خیال ہو کہ خدا نے اس کو چھوڑ دیا ہے؟ اگر خدا نے ابنِ اللہ کو فی الواقع ترک کر دیا تھا اور صلیب پر سے ان کی تمام زندگی کا کام ملیامیٹ (ختم) ہو گیا تھا تو وہ اپنے آخری دم فاتحانہ انداز سے "بڑی آواز سے پکار کے "کیوں اعلان کرتے ہیں کہ خدا کا وہ کام جو اس نے ابنِ اللہ کے سپرد کیا تھا" پورا ہوا" (یوحنا ۱۹:۳۰) اور یہ تمام الفاظ کچھ ایسے انداز سے بآواز بلند فرمائے گئے کہ سخت دلِ رومی صوبہ دار تک متاثر ہو گئے (لوقا ۲۳:۴۷)، لیکن معترض حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر کے حضرت کلمتہ اللہ کی شان میں بے ادبی کرنے سے ذرا نہیں جھجکتے اور کہتے ہیں کہ "مسیح اس عاجزانہ حالت میں صلیب پر لٹکتے ہوئے گویا یہ شعر پڑھ رہے ہیں۔

ضعف نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

(صفحہ ۱۰۳)

ہر انجیل خوان حضرت ابنِ اللہ کی زندگی کی آخری ساعتوں کا حال پڑھ کر دیکھ سکتا ہے کہ "عاجزانہ حالت" اور "ضعف" آنخداوند کے پاس پھٹکے بھی نہ تھے۔ آپ فاتحانہ انداز میں سردار کاہن کو فرماتے ہیں "اب سے ابن آدم قادر مطلق خدا کی دہنی طرف بیٹھا رہے گا" (لوقا ۲۲:۶۹) اور میں اس ستودہ (خدا) کا بیٹا مسیح ہوں اور "تم ابن آدم کو قادر مطلق کی دہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں کے ساتھ آتے دیکھو گے" (مرقس ۱۴:۶۲) اور گورنر پلاطوس کو مخاطب کر کے کہتے ہیں میں حق کا بادشاہ ہوں۔" میں اس لئے پیدا ہوا اور اس واسطے دنیا میں آیا ہوں کہ حق پر گواہی دوں۔ جو کوئی حقانی (حق سے نسبت رکھنے والا) ہے وہ میری آواز سنتا ہے" (یوحنا ۱۸:۳۷تا۳۸)۔

ابنِ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ کا اس دنیا میں آنے کا واحد مقصد یہ تھا کہ آپ خدا کی مرضی کو پورا کریں۔ آپ نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ باپ کی مرضی کو پورا کرنے میں صرف کیا (یوحنا ۵:۲۰۔ ۵:۳۰۔ ۶:۳۷۔ ۷:۱۶۔ ۱۲:۱۰۔ ۱۹:۳۲ وغیرہ) اپنی زندگی کی آخری شب آپ نے خدا سے التجا کر کے کہا تھا" اے باپ۔ میری مرضی نہیں بلکہ تیری مرضی پوری ہو"۔ اب جب وہ خدا کے ارادے اور منشاء اور مرضی کے مطابق فرمانبرداری

سے موت بلکہ صلیبی موت کو برداشت کر کے خدا کی مرضی کو پورا کر رہے ہیں تو خدا ان سے کس طرح جدا ہو سکتا ہے؟ ان کی دعا کے الفاظ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ ابن اللہ کی نظروں کے سامنے صلیب تھی اور مولوی صاحب کے قیاس (صفحہ ۱۹۰) کے خلاف ابنِ اللہ کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ خدا کسی خوارقِ (خارج کی جمع، خلاف عادت، کرامتیں) عادت طور پر آپ کو صلیبی موت سے بچائے گا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ صلیب کی راہ عین خدا کی مرضی کے مطابق ہے (متی ۱۶: ۲۱ تا ۲۸)۔ پس اگر مولوی صاحب کی تفسیر صحیح ہے تو ہمارا یہ حق ہے کہ ہم ان سے پوچھیں کہ ان باتوں کے پیشِ نظر ہونے کے باوجود ابنِ اللہ نے کیوں ایک ایسا کلمہ زبان سے نکالا جس سے بقول آپ کے یاس وناامیدی ٹپکتی تھی؟ ان کا فرض ہے کہ وہ ہم کو بتلائیں کہ یاس اور ناامیدی کس چیز کی نسبت تھی؟ وہ کیا اُمید تھی جو برنہ آئی اور جس کے پورا نہ ہونے کے باعث یہ یاس انگیز کلمہ بقول معترض ابنِ اللہ کے منہ سے نکلا؟ ابن اللہ تو اپنے تجربے سے جانتے تھے کہ آپ دنیا اور شیطان پر غالب آگئے ہیں (متی ۴: ۱۱۔ یوحنا ۱۶: ۳۳ وغیرہ) دریں حال (اس صورت میں) دم واپسیں ناامیدی اور یاس (مایوسی) کی کیا وجہ تھی؟ قیاس تو یہ چاہتا ہے کہ ایک شخص پر جو بقول مولوی صاحب "زاری لاچاری" کی عاجزانہ حالت میں صلیب پر لٹکا" ہو مایوسی اسی قدر غالب ہو گی کہ اس کی یاس اور ناامیدی کی آواز دھیمی نکلے گی۔ لیکن ابنِ اللہ کی بلند واور "بڑی آواز کی پکار" (لوقا ۲۳: ۴۲۔ متی ۲۷: ۵۰۔ مرقس ۱۵: ۳۷) یہ ثابت کرتی ہے کہ ناامیدی، مایوسی اور یاس صلیب کے نزدیک پھٹکنے بھی نہ پائی تھی۔ بلکہ یہ "بڑی آواز کی پکار" ایک فاتحانہ آواز تھی جو جسم کی کمزوری اور اذیت کے باوجود الہیٰ رفاقت اور قربت کی وجہ سے بلند تھی جس کو سن کر صوبہ دار بھی مرعوب ہو کر مان گیا کہ "بے شک یہ آدمی راست باز تھا" (لوقا ۲۳: ۴۷)۔

سطور بالا میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ آخری شب گتسمنی باغ میں ابن اللہ نے اپنے آپ کو خدا کے ہاتھوں میں سپرد کر دیا تھا اور کہا تھا" اے باپ! میری مرضی نہیں بلکہ تیری مرضی پوری ہو"۔ جس سے آپ کا مطلب محض "گردن برضائے الٰہی کو محض سر تسلیم خم کرنے سے پورا نہیں کر سکتا بلکہ الٰہی ارادہ اور منشاء کے ساتھ خیال قول اور فعل سے بدل وجان عملی تعاون کرنے سے پورا کرتا ہے (یوحنا ۱۲: ۲۷ تا ۲۸)۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے دعا ختم کرنے کے بعد ہی شاگردوں کو ارشاد فرمایا" اٹھو چلیں" (مرقس ۱۴: ۴۲) تاکہ خدا کی مرضی کو پورا کریں اور موت کو خدا کی محبت اور اس کے جلال کا وسیلہ بنائیں (لوقا ۲۴: ۲۶) آپ مُدت سے اس موت کے پیالہ کے منتظر تھے۔ اور جامِ شہادت کو پینے کے خواہش مند تھے (متی ۲۱: ۲۲) آپ نے علی الاعلان (گواہوں کے روبرو، علانیہ طور پر) فرمایا تھا کہ "مجھے (صلیبی موت کا بپتسمہ لینا ہے۔ اور جب تک وہ نہ ہو لے میں بہت ہی تنگ رہوں گا" (لوقا ۱۲: ۵۰) کیونکہ آپ کو یہ علم تھا کہ آپ کی موت بھی آپ کی زندگی کی طرح "بہتوں کے فدیہ" کے لئے ضروری اور لازمی ہے (مرقس ۱۰: ۴۵)۔ آپ نے اپنی موت کی وجہ بتلا کر فرمایا" وہ وقت آگیا کہ ابنِ آدم جلال پائے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک گیہوں کا دانہ زمین میں گر کر مر نہیں جاتا اکیلا رہتا ہے۔ لیکن جب مر جاتا ہے تو بہت سا پھل لاتا ہے۔ جو اپنی جان کو عزیز رکھتا ہے وہ اسے کھو دیتا ہے اور جو دنیا میں اپنی جان سے عداوت رکھتا ہے وہ اسے ہمیشہ کی زندگی کے لئے محفوظ رکھے گا۔۔۔ پس میں کیا کہوں کہ اے باپ مجھے اس گھڑی سے بچا؟ لیکن میں اسی سبب سے تو اس گھڑی کو پہنچا ہوں۔ اے باپ! اپنے نام کو جلال دے۔ پس آسمان سے آواز آئی کہ میں نے اس کو جلال دیا ہے اور پھر بھی دوں گا" (یوحنا ۱۲: ۲۳ تا ۲۸) معترض کو ذرا خیال نہ آیا کہ اس قسم کے شخص کے منہ سے کس طرح دم واپسیں کوئی یاس انگیز کلمہ نکل سکتا ہے؟

انجیل کی قطعی نص

مولوی صاحب۔ آیئے ہم آپ کو ابنِ اللہ کے وہ کلمات طیبات سنائیں جو آپ کے وہم کے خلاف ایک قاطع اور قطعی دلیل ہیں۔ آپ تو بغیر کسی دلیل کے دعوٰے کرتے ہیں کہ خدا نے ابنِ اللہ کو ترک کر دیا تھا، لیکن سنئے ابنِ اللہ کو ترک کر دیا تھا لیکن سنئے ابنِ اللہ خود یہود کو کیا فرماتے ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا" میں اکیلا نہیں بلکہ میں ہوں اور باپ ہے جس نے مجھے بھیجا ہے "(یوحنا۸:۱۶)۔ پھر بتاکید فرمایا" جس نے مجھے بھیجا ہے۔ وہ میرے ساتھ ہے۔ اس نے مجھے اکیلا نہیں چھوڑا"۔ اور ساتھ ہی وجہ بھی بتلادی۔ "کیونکہ ہمیں ہمیشہ وہی کام کرتا ہوں جو اسے پسند ہیں "(یوحنا۹:۲۹) پھر آپ نے اپنی زندگی کی آخری شب شاگردوں کو فرمایا۔ "تم سب پراگندہ ہو کر اپنے اپنے گھر کی راہ لوگے اور مجھے اکیلا چھوڑ دوگے۔ تو بھی میں اکیلا نہیں ہوں کیونکہ باپ میرے ساتھ ہے "(یوحنا۱۶:۳۲) کیا یہ انجیلی نقص قطعی طور پر آپ کے اعتراض کا منہ بند نہیں کر دیتی؟ باپ کی محبت آپ کو ہر لحظہ چاروں طرف زندگی میں ہر لمحہ موت میں گھیرے رہی۔ آپ خدا کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ "اے باپ میں تیرا شکر کرتا ہوں کہ تونے میری سن لی اور مجھے تو معلوم ہے کہ تو ہمیشہ میری سنتا ہے "(یوحنا ۱۱:۴۱) اور عبرانیوں کے خط کا مصنف اس پر صادر کر کے کہتا ہے کہ۔ خدا نے زندگی اور موت دونوں حالتوں میں ابنِ اللہ کی سنی (عبرانیوں ۵:۷ تا ۸) اور اس کا رفیق رہا۔

مقدس پولوس رسول بھی فرماتا ہے کہ "خدا اپنی محبت کی خوبی ہم پر یوں ظاہر کرتا ہے۔ کہ جب ہم گنہگار ہی تھے تو مسیح ہماری خاطر موا۔ پس ہم اپنے سیدنا مسیح کے سبب جس کے وسیلے سے اب ہمارا خدا کے ساتھ میل ہو گیا خدا پر فخر کرتے ہیں "(رومیوں ۵:۸ تا ۱۱)۔ اب مولوی صاحب ہی فرمائیں کہ اگر خدا نے عین صلیب کے موقع پر مسیح مصلوب کو چھوڑ دیا تھا تو اس نے "اپنی محبت کی خوبی" کا اظہار کس طرح کیا؟ اور ہم کس بات پر اور کس طرح فخر "کر سکتے ہیں؟

اس سلسلہ میں ڈاکٹر بٹرک کے الفاظ قابل غور ہیں وہ کہتا ہے [1]

> "ہم جانتے ہیں کہ دیندار یہودی مصیبت کے وقت اس زبور کو پڑھ کر تسلی حاصل کیا کرتے تھے۔ یہ امر یقینی ہے کہ ان الفاظ کی تلاوت سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ سیدنا مسیح اپنا ایمان کھو بیٹھے تھے اور کہ خدا کی رفاقت آپ کو نصیب نہ تھی۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ اگرچہ سب آپ کو چھوڑ کر چلے گئے تھے لیکن خدا آپ کے ساتھ تھا۔ اور اس سے پہلے آپ کو خدا کی ایسی قربت کبھی حاصل نہ ہوئی تھی جیسی اس لمحہ میں حاصل تھی۔ جب آپ خدا کی کامل فرمانبرداری کر کے اپنی جان قربان کر رہے تھے۔ خدا باپ نے اپنے بیٹے کو اس لمحہ میں ایسی قربت عطا کی تھی کہ وہ مسیح میں ہو کر اپنے ساتھ دنیا کا میل ملاپ کر رہا تھا" (۲۔ کرنتھیوں ۵:۱۳)۔

مقدس پولوس کو مسیح مصلوب کے ایثار، موت اور قربانی میں خدا کا مقصد نظر آتا ہے چنانچہ وہ فرماتا ہے کہ "خدا نے مسیح میں ہو کر اپنے ساتھ دنیا کا میل ملاپ کر لیا" (۲۔ کرنتھیوں ۵:۸) دیکھئے الفاظ "خدا نے مسیح میں ہو کر" کیسے صاف واضح اور غیر مبہم ہیں۔ خدا نے مسیح سے جدا ہو کر اور

[1] George A.Buttrick
Exegesis and Exposition of St. Matthew in vol 7 of the Interpreter's Bible pp.608 -609

اس کو ترک کر کے نہیں بلکہ "مسیح میں ہو کر اپنے ساتھ دنیا کا میل ملاپ کر لیا"۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ صلیبی موت کے وقت باپ ابنِ اللہ کے ذریعے اور اس میں ہو کر نجات کا کام کرتا ہے۔ کیونکہ بیٹا باپ کا مظہر ہے (افسیوں ۲:۴تا۵۔ گلتیوں ۴:۳تا۶ وغیرہ)۔

حق تو یہ ہے کہ خدا اپنے بیٹے سے صلیب کے موقع پر خاص طور پر "خوش" تھا۔ کیونکہ خدا کی محبت کا نظارہ ہم کو اعلیٰ ترین جلالی صورت میں صلیب پر ہی ملتا ہے۔ خدا محبت اور سیدنا مسیح کی زندگی اور موت اس محبت کے جلال کا کامل اور اکمل ظہور ہیں۔ ابنِ اللہ مجسم محبت تھے۔ آپ نے اپنی محبت کا اظہارِ خلق کی خدمت، ایثارِ نفس اور کامل قربانی کے ذریعہ کیا (متی ۲۰:۲۸۔ مرقس ۱۰:۴۵۔ ۱۰:۱۷تا۱۸۔ ۱۳:۱تا۷۔ ۳:۱۳۔ ۴:۲۱۔ ۳۴:۵: ۱۷، ۴۴۔ ۸باب ۱۷:۱۔ وغیرہ)۔ جس طرح ابنِ اللہ کی زندگی ایثار کے ذریعہ خدا کی محبت کا ظہور تھی جس کے وسیلے سب پر عیاں ہو گیا تھا کہ "خدا اس کے ساتھ ہے" (اعمال ۱۰:۳۸) اسی طرح آپ کی موت ایثار و محبت کا ثبوت تھی اور موت کے وقت بھی خدا آپ کے ساتھ تھا کیونکہ آپ محبوبِ کبریا تھے (متی ۳:۱۷۔ ۱۷:۵)۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ "باپ مجھ سے اس لئے محبت رکھتا ہے کہ میں اپنی جان دیتا ہوں۔ کوئی اسے مجھ سے چھینتا نہیں بلکہ میں اسے آپ ہی دیتا ہوں" (یوحنا ۱۰:۱۷تا۱۸) آپ کی مبارک موت آپ کی زندگی کا کمال اور تاج تھی۔ جب خدا نے آپ کی زندگی میں آپ کا ساتھ نہ چھوڑا تو وہ آپ کی موت میں آپ کو کیسے چھوڑ سکتا تھا؟ بالخصوص جب یہ مبارک موت آپ کی زندگی کا کمال تھی؟ آپ نے زندگی اور موت دونوں میں اپنی جان دوسروں کے لئے نثار کر دی (۱۔ یوحنا ۳:۱۶؛ متی ۲۰:۲۸) جس طرح بنی اسرائیل کو کوہِ سینا پر پرانے عہد نامہ کا جلوہ نظر آیا اسی طرح کوہِ کلوری پر الٰہی محبت کے کمال کے لئے عہد کا جلوہ نظر آتا ہے۔ صلیب پر کا تجربہ ابنِ اللہ کے ایمان اور کاملیت کا ظہور ہے (فلپیوں ۲:۸تا۱۱)۔ عبرانیوں کے خط کا مصنف ہم کو بتلاتا ہے کہ ابنِ اللہ کی نظروں کے سامنے ناامیدی اور یاس نہیں بلکہ ایک عجیب خوشی تھی اور کہتا ہے کہ "ہمارے ایمان کے بانی اور کامل کرنے والے یسوع نے اس خوشی کے لئے جو اس کی نظروں کے سامنے تھی شرمندگی کی پرواہ نہ کر کے صلیب کا دکھ سہا اور خدا کے تخت کی دہنی طرف جا بیٹھا (عبرانیوں ۱۲:۲) ابن اللہ کی نگاہ اس "خوشی" پر ٹکی ہوئی تھی (زبور ۱۱۹:۳۵) جس کی وجہ سے آپ نے صلیب کی انتہائی "شرمندگی" کی پرواہ نہ کی۔ یہ "خوشی" کیا تھی؟ ابن اللہ اپنی ظفریاب (فتح مند) قیامت کے بعد اپنی زبانِ معجز بیان سے اپنے شاگردوں کو اور مرحوم کے ہم خیالوں کو اس خوشی کی نسبت بتلاتے ہیں۔ "اے نادانو اور نبیوں کی ساری باتوں کے ماننے میں سست اعتقادو، کیا مسیح کو یہ دکھ اٹھا کر اپنے جلال میں داخل ہونا ضرور نہ تھا؟ (لوقا ۲۴:۲۵) آپ کامل اور مجسم محبت تھے اور محبت ایثار کا دوسرا نام ہے۔ ایثار تب ہی کامل ہوتا ہے جب اس میں خوشی ہو اور یہ خوشی ایثار کا جلال ہوتی ہے۔ کسی ماں سے پوچھو کہ وہ اپنے بیمار بچہ کو کسی دایہ یا نرس کے سپرد کرنے کے بجائے اس کی خدمت میں قربانی اور ایثار نفس سے کام لے کر رات دن ایک کیوں کر دیتی ہے؟ ماں کی مامتا کی خوشی ایسے ایثار اور قربانی میں ہی پوری ہوتی ہے اور یہ خوشی ماں کی محبت ایثار کا جلال ہے۔ چنانچہ ابنِ اللہ نے بھی آخری شب اپنے شاگردوں کو فرمایا "میں نے یہ باتیں اس لئے تم سے کہی ہیں کہ میری خوشی تم میں ہو اور تمہاری خوشی پوری ہو جائے۔ اس سے زیادہ محبت کوئی شخص نہیں کر سکتا کہ اپنی جان اپنے دوستوں کے لئے دے دے" (یوحنا ۱۵:۱۳؛ یسعیاہ ۵۳:۱۱) ابنِ اللہ نے جو دعا آخری شب کی تھی اس میں آپ نے خدا کو مخاطب کر کے کہا "اے باپ۔ وہ گھڑی آ پہنچی اپنے بیٹے کا جلال ظاہر کر تا کہ بیٹا تیرا جلال ظاہر کرے۔ جو کام تو نے مجھے کرنے کو دیا تھا اس کو پورا کر کے میں نے زمین پر تیرا جلال ظاہر کیا اور اب اے باپ تو اس جلال سے جو میں دنیا کے پیشتر تیرے ساتھ رکھتا تھا مجھے اپنے ساتھ جلالی بنا لے" (یوحنا ۱۷:۱۵)۔

مولوی صاحب کی تفسیر قرآن کے مخالف

پس انجیل جلیل کے مطالعہ سے ثابت ہو جاتا ہے کہ مرحوم مولوی صاحب کی تفسیر غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شہادت ، کلمتہ اللہ کی شہادت۔ حوارئین کی گواہی، ابن اللہ کی زندگی کے آخری ہفتہ کے واقعات۔ آپ کی صلیب اور اذیت کا ایک ایک لمحہ اور انجیل جلیل کی ایک ایک آیت ان کی تفسیر کا غلط ثابت کرتی ہے۔ اگر معترض ان سے قائل نہیں ہوئے تو کم از کم قرآن وحدیث کے تو آپ قائل ہیں۔ اور یہ دونوں عصمتِ مسیح پر شاہد ہیں (سورہ عمران آیت ۳۱ وغیرہ مشارق الانوار صفحہ ۹۲۹)۔ جس حال کہ کلمتہ اللہ بے گناہ اور معصوم تھے تو خدا آپ کو کیسے چھوڑ سکتا تھا؟ کیا خدا بے گناہ ایمان دار بندوں اور اپنے معصوم رسولوں کو جانکنی کی حالت میں ترک کر دیا کرتا ہے۔ بالخصوص جب وہ اپنے پیغام کی وجہ سے مصائب وآلام میں مبتلا ہوں؟ معترض نے بائیسویں (۲۲) زبور کی آیت کی تاویل کرتے وقت قرآن وحدیث کا ہی پاس اور لحاظ کیا ہوتا۔ کیا اسلامی عقائد کے مطابق خدا ان رسولوں کو جو رضائے الٰہی کو پورا کرتے ہیں ان کی موت کے وقت مایوسی اور ناامیدی کی حالت میں چھوڑ کر ان کو ترک کر دیا کرتا ہے۔ قرآن وحدیث کے مطابق مسیح کی شان ایسی ہے کہ موت کے وقت خدا آپ کو مایوسی کی حالت چھوڑ دیتا؟ وہ جو خدا کا معصوم نبی اور کلمہ ہے اور روح اللہ ہے اور خدا کا رسول اور فرمانبردار بندہ ہے اور جس پر اللہ تعالیٰ نے احسان کئے کیا اس کا انجام ایسا حسرت ناک ہو سکتا ہے؟ قرآن صاف طور پر کہتا ہے کہ **اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ** (سورۃ آل عمران آیت ۴۵) کہ عیسیٰ دنیا اور آخرت دونوں میں رودار اور خدا کے مقربوں میں سے ہے"۔ کیا "**مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ**" کی یہی تفسیر ہے کہ موت کے وقت اس کو خدا کی قربت اور رفاقت بھی نصیب نہ ہو؟

اگر معترض آنجہانی مرزائے قادیانی کی پیروی کر کے یہ کہیں کہ ہم حضرت عیسیٰ کی نسبت یہ نہیں مانتے لیکن عیسائیوں کی انجیل یسوع مسیح کی نسبت یہ کہتی ہے تو وہ گویا دنیا پر روشن کر دیتے ہیں کہ وہ ایک ایسی بات پیش کرتے ہیں جس کو وہ نہ تو خود مانتے ہیں اور نہ ان کے مخاطب مانتے ہیں اور یہ ایک ایسی شرمناک پوزیشن ہے جس کو کوئی حق پسند جائز نہیں رکھ سکتا۔

مرحوم مولوی صاحب پر واجب تھا کہ اگر وہ کلمتہ اللہ کے متعلق قرآن کی شہادت سے کوئی ایسی بات مانتے ہیں جس کا ذکر انجیل میں ان کے زعم (غرور، گمان) میں اس کے خلاف ہے اور اگر انجیل جلیل کے کسی قول سے کوئی وسوسہ (اندیشہ) ان کے دل میں پیدا ہوا تھا تو ان کو اس کی تاویل اس طور سے کرنا چاہیے تھی جو اس کو قرآن کے مطابق کر دے۔ کیونکہ قرآن کے مطابق انجیل کلامِ الٰہی ہے جس کا وہ خود محافظ اور مصدق ہے (سورہ مائدہ ع ۶۔ آیات ۴۸ تا ۵۲ و ۹۱ وغیرہ) جس کے مفہوم کو اہلِ عرب پر ظاہر کرنے کی خاطر وہ عربی زبان میں نازل کیا گیا (شعرا آیت ۱۹۷۔ انعام ع ۲۰ آیات ۱۵۶ تا ۱۵۸ وغیرہ)۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے مطابق سچا مسلمان صرف وہی ہو سکتا ہے جو انجیل پر بھی ایمان رکھے (سورہ بقرہ آیت ۳ وغیرہ) اور چونکہ خدا کے کلام میں تضاد وتناقص نہیں ہوتا (سورہ نساء آیت ۸۴) لہٰذا قرآن وانجیل کی تاویل کا اصول بھی ایک ہی ہے (سورہ یونس آیت ۹۴)۔ یہ قرآنی اصول صحیح اُصول تفسیر ہے جس کی مفصل تشریح ہم اپنے رسالہ "توضیح البیان فی اصول القرآن" میں کر چکے ہیں۔ لیکن مولوی صاحب نے صحیح تاویل کرنے کی بجائے ایسی تاویل کی جو نہ صرف قرآن کے خلاف ہے بلکہ انجیل جلیل کے ایک ایک لفظ کے خلاف ہے اور قرآن وانجیل دونوں اس کو متفقہ طور پر باطل اور مردود قرار دیتے ہیں۔

گر تو قرآں بریں غلط خوانی
ببری رونقِ مسلمانی

اگر معترضین کے ایمان نے ان کو غلط تاویل کرنا ہی سکھلایا ہے تو قرآن ان کو مخاطب کر کے کہتا ہے **قل بئسما یامرکمہ بہ ایمانکمہ وان کنتمہ مومنین** تو کہہ اگر تمہارا ایمان یہی ہے اور تم ہی ایمان دار ہو تو تمہارا ایمان تم کو بُرا سکھاتا ہے۔

اس باب میں ہم نے یہ ثابت کیا ہے:

(۱۔) مولوی ثناء اللہ صاحب نے دیدہ ودانستہ واقعات صحیحہ کا اخفا (پوشیدہ کرنا) "کر کے عامتہ الناس کو یہ مغالطہ دینا چاہا ہے کہ آیہ زیر بحث ابن اللہ کا اپنا "مقولہ "ہے۔ حالانکہ یہ کلمہ آنخداوند کا اپنا "مقولہ "نہیں ہے۔ بلکہ بائیسویں (۲۲) زبور کی پہلی آیت ہے جس کی منجی کونین نے صلیب پر سے تلاوت فرمائی۔ اس بحث کے دوران میں مولوی صاحب نے حضرت کلمتہ اللہ کی شان میں اس قدر سوادبی کا ارتکاب کیا ہے کہ الامان۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

(۲۔) ہم نے انجیل جلیل سے ثابت کیا ہے کہ مولوی ثناء اللہ کا استدلال کہ یہ کلمہ ظاہر کرتا ہے کہ خدا میں اور مسیح میں جدائی اور دوری تھی اور کہ خدا نے آپ کو معاذ اللہ چھوڑ دیا تھا صریحاً غلط ہے۔ یہ تاویل تفسیر بالرائے کی عمدہ مثال ہے جس کے خلاف مرحوم خود جہاد کرتے رہے۔ یہ تفسیر حضرت کلمتہ اللہ کے کلمات، طیبات، خیالات، جذبات اور افعال کی ضد ہے اور انجیل جلیل کی آیات بینات کی عین نقیض ہے۔ مولوی صاحب نے آیہ زیر بحث کو اس طرح مایل کر دیا ہے اور آپ کی تاویل ایسے درجہ پر پہنچ گئی ہے کہ اس تاویل "کا لفظ" بھی صادق نہیں آسکتا۔ مولوی صاحب کی تاویل القول بمالا یرضیٰ بہ قایلہ کے غلط اصل کے مطابق ہے۔ لہٰذا مردود ہے۔

باب سوم

آیہ زیرِ بحث کا مفہوم

فصل اوّل

بائیسواں زبور

بائیسویں (۲۲) زبور کی شانِ نزول

زبور کی کتاب ایک مجموعہ ہے جو قوم یہود کے بہترین شعراء کے ملی اور مذہبی کلام کا انتخاب ہے۔ یہ یہودی شاعر حضرت داؤد سے لے کر مختلف زمانوں میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنے اپنے وقت کے کوائف وحالات کو پیش نظر رکھ کر ان مزامیر کو منظوم کیا۔ بعض مزامیر قوم یہود کی

خوشحالی کے زمانہ میں لکھے گئے اور بعض اس قوم کے زوال کے زمانہ میں منظوم کئے گئے۔ بائیسواں زبور اور چند دیگر مزامیر (مثلاً: ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۳۱، ۳۵، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۶۹، ۷۱ وغیرہ) کی طرح قوم اسرائیل کی پستی، ذلت، مصیبت اور زوال کے زمانہ میں لکھا گیا۔ اس زبور کے مطالعہ سے عیاں ہے کہ مزمور نویس کے ارد گرد کے حالات اس قدر تاریک ہیں کہ قوم یہود پڑی سسک (ہچکی، سبکی) رہی ہے۔ دم توڑ رہی ہے اور فنا ہونے کے قریب ہے۔ بُت پرست اقوام نے خدا کی اپنی قوم کو جو اقوام عالم کے لئے ایک نور تھی (یسعیاہ ۴۲: ۷) چاروں طرف نرغہ میں گھیر رکھا ہے (آیت ۶، ۱۲، ۲۱) مزمور نویس کے دل میں بیم ورجا کی کشمکش ہے۔ اور اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اپنی برگزیدہ قوم کو ترک کر دیا ہے (آیت ۱) "صیون کہتی ہے یہواہ نے مجھے ترک کیا ہے اور خداوند مجھے بھول گیا ہے" (یسعیاہ ۴۹: ۱۴، زبور ۱۳: ۱؛ ۸۸: ۱۴) بعض مفسرین کا خیال ہے کہ (۲۲ زبور) حضرت نحمیاہ کے زمانے کے حالات کا آئینہ ہے۔ جب قوم اسرائیل "نہایت مصیبت اور ذلت" کی حالت میں گرفتار تھی (نحمیاہ ۱: ۳) وہ اس زبور کی ساتویں آیت کی (نحمیاہ ۴: ۲) کے ذریعہ اور چھٹی آیت کی (نحمیاہ ۲: ۱۹) کے ذریعہ تعبیر کرتے ہیں۔ ان مفسرین کا خیال ہے کہ آیت ۱۲ سے مراد عمونی ہیں۔ (صفنیاہ ۲: ۸۔ یرمیاہ ۴۹: ۱) اور تیرھویں آیت سے مراد قبائل عرب ہیں اور آیت (۲۲: ۱۶ و ۱۷) سے مراد سکم کے رہنے والے ہیں۔

اس زبور کا مطلب

بائیسویں (۲۲) زبور کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کا مصنف شاعر (جو خود ایک ایمان دار شخص ہے) ناموافق حالات کی تاریکی میں اپنے ایمان کے ذریعہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ایک قوم جو اقوام عالم میں سے خدا کی واحد پرستار ہے کیوں فنا ہو رہی ہے؟ پہلی آیت میں لفظ "کیوں" خدا کی پروردگاری پر شک نہیں کرتا بلکہ اس سے مراد تعجب کا سوال اور حیرانگی کا اظہار ہے۔ وہ پوچھتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ خدا کی برگزیدہ قوم فنا ہو رہی ہے؟ مزمور نویس متعجب ہو کر سوال کرتا ہے کہ خدا نے قوم اسرائیل کو کیوں ترک کر دیا ہے؟ اور اس قوم کی پکار اس کے نجات دینے والے خدا سے کیوں دور ہے؟ وہ کیوں نہیں سنتا؟ قوم کی حالت ایسی ہے کہ وہ شب وروز بے قراری کی حالت میں پڑی کراہتی ہے (زبور ۲۲: ۱، ۲) خدا تو قوم اسرائیل کا قدوس خدا ہے جو زمانہ ماضی میں اس کے دشمنوں کے ہاتھوں سے رہائی دیتا رہا ہے (زبور ۲۲: ۴) اور جس کا وعدہ ہے کہ وہ ایام مستقبل میں بھی اپنی قوم کو چھڑائے گا۔ (استثنا ۳۰: ۳ تا ۴ وغیرہ) قوم اسرائیل کی زبونی کا اَب یہ حال ہو گیا ہے کہ وہ ایک کیڑے کی مانند ہو گئی ہے (زبور ۲۲: ۶؛ یسعیاہ ۴۱: ۱۴) جس کو بُت پرست اقوام حقیر جان کر انگشت نمائی کرتی ہیں (زبور ۲۲: ۶، ۷؛ یسعیاہ ۴۹: ۷؛ ۵۳: ۳) یہ بُت پرست اقوام از روئے تمسخر اسرائیل کا ٹھٹھا کر کے کہتی ہیں کہ اس قوم نے خدا پر توکل کیا تھا۔ اب اس کو چھڑانے والا خدا آئے۔ اور اپنی برگزیدہ قوم کو ہمارے ہاتھوں سے چھڑا لے (زبور ۲۲: ۸؛ یسعیاہ ۴۱: ۱۴؛ ۴۳: ۱۴؛ ۴۴: ۶، ۲۴؛ ۴۷: ۴؛ ۴۸: ۷؛ ۴۹: ۷، ۲۶؛ ۵۴: ۵، ۸) قوم پر ہلاکت آپڑی ہے (زبور ۲۲: ۱۱) اور بُت پرست اقوام جنگی درندوں، کتوں اور سانڈوں کی طرح اُس پر پے در پے حملے کر رہی ہیں (زبور ۲۲: ۱۲ تا ۱۹)۔ قوم کی زندگی معرض خطر میں ہے اور اس کے دشمن شادیانے بجا رہے ہیں۔ ایسے نازک ایام میں اسرائیل کی قوم اپنے خدا سے فریاد کر کے کہتی ہے کہ اے خدا اپنی برگزیدہ قوم اسرائیل کو بُت پرست اقوام کے ہلاکت آفرین ہاتھوں سے بچا (زبور ۲۲: ۱۹، ۲۰) پھر مزمور نویس شاعر کہتا ہے کہ بلا آخر خدا نے اس تنگی کی حالت میں قوم اسرائیل کی گریہ وزاری کی آواز اور دعا سن کر اس کو رہائی بخشی (زبور ۲۲: ۲۱، ۲۴) پس قوم اس نجات کو کبھی فراموش نہ کرے گی۔ بلکہ خدا کی ثنا خواں ہو کر اس کی ستائش اور مدح سرائی کرے گی (زبور ۲۲: ۲۲ تا ۲۶) اور شکر گزار ہو کر بُت پرست اقوام کو خدا کے علم اور اس کی نجات کی بشارت دے گی۔ تاکہ کل اقوام عالم یہ جان لیں کہ سلطنت خداوند کی ہے اور وہی اقوام عالم کا واحد خدا ہے (زبور ۲۲: ۲۷ تا آخر)۔

پس یہ زبور ایک قوم کی چیخ وپکار کی آواز ہے جو وہ اپنی ملی زندگی اور قومی ہستی کی معرضِ خطر میں پڑا دیکھ کر خدا کے حضور کرتی ہے۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ ایسے آڑے وقت میں بھی جب قوم ہلاک اور فنا ہوتی نظر آتی ہے مزمور نویس کا ایمان متزلزل نہیں ہوتا۔ اور گو حالات بظاہر ایسے یاس انگیز ہیں کہ نااُمیدی کی تاریک گھٹائیں ہر طرف سے اس قوم کو گھیرے ہوئے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اس قوم کو چھوڑ دیا ہے۔ تاہم مزمور نویس کے ایمان کا نور گھٹاٹوپ اندھیرے میں بھی چمکتا ہے جس کی ضیا پاشیوں سے یاس کی پکار نجات اور رہائی کے نعروں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

سطور بالا میں حوالہ جات دیئے گئے ہیں ان میں ناظرین نے ملاحظہ کیا ہو گا۔ کہ ۲۲واں زبور اور حضرت یسعیاہ نبی کے صحیفہ کے دوسرے حصے (ابواب ۴۰ تا آخر) میں مشابہت اور مطابقت پائی جاتی ہے۔ "خادمِ یہوواہ" ایک "کیڑا" ہے (یسعیاہ ۴۱: ۱۴) اور قوم اسرائیل ایک ایسی جماعت ہے۔ جس کو لوگ حقیر سمجھ کر (یسعیاہ ۴۹: ۷؛ ۵۳: ۳) اس سے کنارہ کش ہوتے ہیں گویا کہ وہ جنس انسانی میں شمار ہونے کے قابل ہی نہیں۔ (یسعیاہ ۵۲: ۱۴؛ ۵۳: ۲، ۱۳؛ ۵۱: ۷) لیکن اس کی امید گاہ اس کا رہائی دینے والا خدا اسرائیل کا قدوس اور واحد خدا ہے جس کی وہ واحد پرستار ہے (یسعیاہ ۴۱: ۱۴؛ ۴۳: ۱۴؛ ۴۴: ۶، ۱۴۔ ۴۷: ۴؛ ۴۸: ۱۷؛ ۴۹: ۷، ۲۶؛ ۵۴: ۵، ۸) اس مختصر مقابلہ سے ظاہر ہے کہ (۲۲) ویں زبور کا تعلق صحیفہ مذکور کے اس حصہ سے (جس میں "خادم یہوداہ" کا بار بار ذکر آتا ہے) کس قدر گہرا ہے۔

صیغہ واحد کا استعمال

مذکورہ بالا تفسیر سے ظاہر ہے کہ بائیسویں (۲۲) زبور میں صیغہ واحد متکلم اور واحد غائب قوم بنی اسرائیل کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور تمام زبور میں اس صیغہ کا اطلاق کسی خاص فرد پر نہیں ہے۔ جو حضرات اہل یہود کی کتُب سماوی کی زبان اور محاورات سے ناواقف ہیں وہ مطالعہ میں پڑ کر خیال کرتے ہیں کہ صیغہ واحد کسی خاص فرد کے لئے استعمال ہوا ہے۔ لیکن انبیائے عہدِ عتیق کی صحفِ مقدسہ کا مطالعہ ظاہر کر دیتا ہے کہ واحد کا صیغہ نہ صرف افراد کے لئے استعمال ہوا ہے بلکہ قوموں، گروہوں اور جماعتوں کے لئے بھی عام طور پر کثیر التعداد مقامات میں مستعمل ہوا ہے۔

تورات شریف اور صحائف انبیاء کے بے شمار مقامات میں قوم بنی اسرائیل کے لئے صیغہ واحد حاضر وارد ہوا ہے۔ مثال کے طور پر مشتے نمونہ از خروارے (مٹھی بھر نمونے کے طور پر) ملاحظہ ہو (خروج ۴: ۲۲، استثنا ۶: ۴؛ ۹: ۱؛ ۲۳: ۲۹؛ یسعیاہ ۴: ۲۷؛ ۴۱: ۸؛ ۴۳: ۱ تا ۷؛ ۴۳: ۲۲؛ ۴۴: ۲۱ تا ۲۲؛ یرمیاہ ۲: ۲؛ ۴۶: ۲۷؛ حزقی ایل ۱۳: ۴؛ ہوسیع ۴: ۱۵؛ ۹: ۱؛ عاموس ۴: ۱۲؛ ۶: ۶؛ ۷: ۱۵ تا ۱۷؛ صفنیاہ ۳: ۱۴ تا ۱۵۔ وغیرہ وغیرہ) زبور کی کتاب میں (۸۰) مزامیر یعنی آدھے سے زیادہ مزامیر ایسے ہیں جن میں مزمور نویس شعراء واحد متکلم کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔ ان زبوروں میں بے شمار مقامات میں ایسے مصرعے اور اشعار ہیں جن میں مزمور نویس شعراء واحد حاضر اور واحد متکلم کے صیغے قوم بنی اسرائیل کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ (زبور ۱۲۹) اس کی ایک بین مثال ہے۔ کتاب یرمیاہ کا نوحہ میں قوم اسرائیل صیغہ واحد متکلم میں کلام کرتی ہے۔

کتُب عہد عتیق میں واحد کا صیغہ نہ صرف قوم بنی اسرائیل کے لئے وارد ہوا ہے بلکہ دیگر اقوام کے لئے بھی آیا ہے۔ (یشوع ۹: ۷، گنتی ۲: ۱۲ تا ۲۱؛ ۲۱: ۲۲؛ استثنا ۲: ۲۷ تا ۲۹؛ قضاۃ ۱۱: ۱۹ وغیرہ) بعض اوقات کسی شہر کی آبادی کا ذکر من حیث القوم صیغہ واحد میں آیا ہے (۱۔ سموئیل ۵: ۱۰)۔ بعض مقامات میں صیغہ واحد بنی اسرائیل کے خاص قبائل کے لئے استعمال ہوا ہے۔ (یشوع ۱۷ باب آیات ۱۴ تا آخر۔ قضاۃ ۱: ۳؛ زکریا ۸: ۲۱ وغیرہ) یسعیاہ نبی کے صحیفہ کے دوسرے حصے میں بالخصوص جہاں "خادم یہوواہ" کا ذکر آتا ہے کہ اور صیغہ واحد استعمال کیا گیا ہے ان مقامات میں صیغہ واحد کسی فرد واحد

کے لئے وارد نہیں ہوا بلکہ اس سے قوم بنی اسرائیل کی برگزیدہ جماعت مراد ہے۔ مثلاً (یسعیاہ ۴۲: ۱تا۴؛ ۴۹: ۱تا۶؛ ۵۰: ۴تا۹؛ ۵۲: ۱۳؛ ۵۳: ۱۳)۔ میں صیغہ واحد سے مراد قوم اسرائیل کی خاص جماعت ہے۔ چنانچہ اسی صیغہ کے ۴۹ باب کی پہلی چھ آیات میں واضح الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے کہ صیغہ واحد سے مردا کوئی خاص فرد نہیں۔ بلکہ اسرائیل کی برگزیدہ جماعت مراد ہے۔ امثال کی کتاب کے آٹھویں باب میں شاعر نے حکمت اور خرد اور دانش کو شخصِ واحد قرار دیا ہے۔

پس تورات، زبور اور صحائف انبیاء کی زبان اور محاورات سے ظاہر ہے کہ (۲۲) زبور میں واحد کا صیغہ قوم اسرائیل کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ مستند یہودی مفسرین بائیسویں (۲۲) زبور کی اسی طرح تفسیر کر کے کہتے ہیں کہ اس زبور میں صیغہ متکلم سے مُراد قوم بنی اسرائیل ہے جو مصائب وآلام میں مبتلا ہو کر خدا کو پکارتی ہے اور اس کا رہائی دینے والا خدا اس کی گریہ وزاری کو سن کر اس کی مدد کرتا ہے اور قوم کی پستی اور زبونی سے نجات بخشتا ہے۔

ایلی۔ ایلی۔ لما شبقتنی کا مفہوم

پس اس مزمور شریف کی پہلی آیت۔ "اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا" سے مراد یہ ہے۔ "اے قوم اسرائیل کے خدا، اے قوم اسرائیل کے خدا تو نے بنی اسرائیل کو کیوں چھوڑ دیا؟ تو اپنی برگزیدہ قوم کی فریاد کی آواز سے اور اس کی آہ فغاں سے کیوں دور رہا؟"۔

ناظرین نے مرحوم علامہ اقبال کا شکوہ ضرور پڑھا ہو گا۔ آپ بس یہ سمجھ لیجئے کہ آیہ زیر بحث میں بنی اسرائیل کا شاعر قوم بنی اسرائیل کی طرف سے بعینہ اسی طرح شکوہ کرتا ہے جس طرح علامہ مرحوم نے مسلمانان عالم کی طرف سے بارگاہِ خداوندی میں شکوہ کیا تھا۔ یہ مزمور نویس شاعر دیکھتا ہے کہ بنی اسرائیل کی ملی زندگی معرض خطر میں ہے اور وہ سوال کرتا ہے کہ ایک قوم جو خدائے واحد کی پرستار ہے کیوں فنا ہو رہی ہے؟ واجب تو یہ تھا کہ بُت پرست اقوام پست اور زبون حال ہوتیں۔ زوال اور پستی ایک ایسی قوم کی جزا نہیں ہونی چاہیے جو کل اقوام عالم میں سے خدا کی واحد پرستش کرنے والی ہے۔ ہم مرحوم ڈاکٹر اقبال کی نظم "شکوہ" کے بعض اشعار نقل کرتے ہیں اور ناظرین سے درخواست کرتے ہیں کہ ان کا ۲۲ ویں زبور کے یہودی "شکوہ" کے اشعار کے ساتھ مقابلہ کریں اور دیکھیں کہ دونوں میں کس قدر موافقت و مناسبت ہے:۔

جرات آموز مری تاب سخن ہے مجھ کو شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو
اے خدا شکوہِ ارباب وفا بھی سن لے خوگرحمد سے تھوڑا سا گلہِ بھی سن لے
پھر یہ آزردگی غیر سبب کیا معنی؟ اپنے شیداؤں پہ یہ چشم غضب کیا معنی
ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کامنتظر کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر
خوگر پیکر محسوس تھی انسان کی نظر مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر ؟
تجھ کو معلوم ہے لیتا نہ تھا کوئی نام تیرا قوت بازوئے مسلم نے کیا کام ترا
نقش توحید کاہر دل پہ بٹھایا ہم نے زیر ِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے
اب وہ الطاف نہیں ہم پہ عنایت نہیں بات کیاہے پہلی اسی مدارات نہیں؟
خندہ زن کفر ہے احساس تجھے ہے کہ نہیں اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں؟
طعنِ اغیار ہے۔ رسوائی وناداری ہے کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے ؟
جوئے خوں مے چکدازحسرت دیرینہ ما مے تپد نالہ بہ نشتر کدہ سینہ ما

مندرجہ بالا اشعار میں سے پہلے تین کا مقابلہ (۲۲) زبور کی پہلی دو آیات سے کریں اور ملاحظہ فرمائیں کہ اشعار نمبر ۴،۵ کی روشنی میں تیسری آیت کا مطلب کس طرح واضح ہو جاتا ہے۔ اتنا فرق ضرور ہے کہ علامہ مرحوم نے شاعرانہ مبالغہ سے کام لیا ہے لیکن مزمور نویس ایک سچی اور واضح حقیقت کو بیان کرتا ہے کیونکہ یہ امر ایک تاریخی واقعہ ہے اس کے زمانہ میں صرف قوم بنی اسرائیل ہی دنیا بھر میں ایک ایسی قوم تھی جو خدا کی واحد پرستار تھی اور دنیا کی باقی کل امم بُت پرستی میں مبتلا تھیں۔ شعر نمبر ۶ آیات نمبر ۴، ۵، ۶ کو واضح کرتا ہے اور شعر نمبر ۷، ۸ کی مدد سے ہم آیات ۶ تا ۱۳ کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں اور آخری شعر آیات ۱۴، ۱۵ کا سماں ہماری آنکھوں کے سامنے باندھ دیتا ہے۔

پس (۲۲) زبور ایک "شکوہ" اور شکایت ہے جو کسی زبردست ایمان دار یہودی شاعر نے لکھا ہے۔ اس شاعر کے دل میں قوم کا درد ہے۔ اس کے سینہ میں ملی غیرت کی آگ بھڑک رہی ہے۔ یہ شکوہ اسی قسم کا ہے جس قسم کا حضرت یسعیاہ نبی نے کیا تھا (باب ۶۳ آیات ۱۵ تا آخر باب ۶۴)۔ جس کا جواب بھی خدا نے اس نبی کو دے دیا تھا (یسعیاہ ۴۹: ۱۳ تا ۱۵) اسی قسم کا شکوہ حضرت یرمیاہ نے کیا تھا "۔ اے خداوند میں تیرے ساتھ حجت کروں گا۔ شریر اپنی روش میں کیوں کامیاب ہوتے ہیں؟ انہوں نے جڑ پکڑ لی وہ بڑھ گئے بلکہ برومند ہوئے۔ اے اسرائیل کی اُمید اور مصیبت کے وقت میں اس کے بچانے والے! تو ملک میں پردیسی کی مانند بنا اور اس مسافر کی طرح جو رات کاٹنے کے لئے ڈیرہ ڈالے۔ اے خداوند تو ہمارے درمیان ہے تو ہم کو ترک نہ کر "۔ (یرمیاہ باب ۱۲، ۱۴) یہ "شکوہ" اسی قسم کا ہے جس قسم کا حضرت حبقوق نے کیا۔ "اے خداوند میں کب تک نالہ کروں گا اور تو نہ سنے گا؟ میں تیرے حضور کب تک چلاؤں گا۔ ظلم! ظلم اور تو نہ بچائے گا؟۔۔۔ تیری آنکھیں تو ایسی پاک ہیں کہ تو بدی کو نہیں دیکھ سکتا۔ پھر تو

دغابازوں پر کیوں نظر کرتا ہے اور جب شریر صادق کو نگل جاتا ہے تب تو کیوں خاموش رہتا ہے ؟(حبقوق پہلا باب) یہ اسی قسم کا "شکوہ" ہے جس قسم کا محمد عربی نے کیا تھا۔ قرآن ایسے ہی انبیاء اللہ کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے کہ (سورہ یوسف ع ۱۲) "پہلے لوگ بھی پیغمبروں کو جھٹلاتے رہے) یہاں تک کہ جب رسول ناامید ہو گئے اور ان کو یہ گمان ہوا کہ ان کے ساتھ خدا نے جھوٹے وعدے کئے ہیں تو ان کے پاس ہماری مدد آپہنچی۔۔۔۔ اس میں شک نہیں کہ ان قصوں میں عقلمندوں کے لئے عبرت ہے۔ یہ کچھ بناوٹی بات نہیں ہے لیکن اس کلام (کتبِ آسمانی) کی تصدیق کرتی ہے جو اس کے پہلے ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے جو ایمان والے ہیں ہر چیز کی، تفصیل، ہدایت اور رحمت ہے" (آیات ۱۱۰، ۱۱۱)۔ اُمید ہے کہ اب معترض اس نکتہ کو ان آیات کی مدد سے سمجھ سکے گا۔ قرآنی سورت سورہ نوح حضرت نوح کے شکوہ سے بھری ہے جو وہ درگاہِ الٰہی میں کرتا ہے۔

بائیسویں (۲۲) زبور کا شکوہ اسی قسم کا "شکوہ" ہے جس قسم کا محمد عربی نے کیا تھا۔ جب قریش قرآن کو جھٹلاتے اور کہتے تھے کہ "قرآن ایک جھوٹ بات ہے جو محمد نے گھڑی ہے" (فرقان آیت ۵، ۶) "اور وہ پریشان خوابوں کا مجموعہ ہے" (انبیاء آیت ۵) اور "پہلے لوگوں کی کہانیاں" ہے۔ تب آپ نے درگاہِ الٰہی میں شکایت کی کہ "یا اللہ میری قوم نے قرآن کو ٹھہرایا جھک جھک" (فرقان آیت ۲۲) پھر جب حضرت محمد نے باشندگانِ طائف کو دعوتِ اسلام دی اور وہاں کے غنڈوں نے آپ پر پتھر برسائے جن کے ہاتھوں سے ایک عیسائی نے آپ کو بچایا تو آپ نے شکوہ کر کے کہا۔ اے اللہ میں تیرے حضور اپنی ضعفِ قوت اور لاچاری کی نسبت عرض کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین تو ہی بے چاروں کا چارہ اور میرا کارساز ہے۔ مجھ کو تو کس کے سپرد کرتا ہے؟ کیا تُرش رو اجنبیوں کے اور دشمنوں کے "؟ جنگِ بدر کے روز آپ پر سخت خضوع (عاجزی، گڑگڑانا) کی حالت طاری تھی اور آپ اللہ سے کہتے تھے۔ "یا اللہ اگر کافر فتح مند ہو گئے تو کفر پھیل جائے گا۔ اگر مسلمانوں کی یہ قلیل جماعت ہلاک ہو گئی تو پھر کون تیری پرستش کرے گا؟ اے اللہ میں تیری رحمت سے فریاد چاہتا ہوں"۔

بعینہ اسی طرح بائیسواں (۲۲) زبور ایک شکوہ ہے جو ایک پُردرد دل سے نکلتا ہے۔ مزمور نویس اپنی قوم اسرائیل کی زندگی کو چاروں طرف سے بُت پرست اقوام کے ہلاکت آفرین ہاتھوں میں پڑا دیکھ کر خدا سے شکوہ کرتا ہے کہ اے قوم بنی اسرائیل کے خدا تو نے اپنی قوم بنی اسرائیل کو کیوں چھوڑ دیا ہے؟ اس کے نالہ اور فریاد سے تو کیوں دُور رہتا ہے؟ اے اسرائیل کے خدا تیری قوم شب و روز تیرے حضور گریہ وزاری کرتی ہے تو اس کی مدد کیوں نہیں کرتا؟ تو اس قوم کا واحد خدائے قدوس ہے اور اس قوم کی حمد و ثنا تیرا تخت ہے۔ جس پر تو تخت نشین ہے۔ اگر یہ حمد و ثنا کی آواز خاموش ہو گئی تو تو کس تخت پر بیٹھے گا اور تیری پرستش کون کرے گا؟ اے اسرائیل کی قوم کے چارہ ساز اپنی قوم کی مدد کے لئے جلدی کر" (زبور ۲۲: ۱، ۳، ۱۹)۔

پس یہ آیت "شکوہ اربابِ وفا" ہے۔ یہ راز و نیاز کی باتیں ہیں۔ جو محب صادق اور محبوب کے درمیان اور "قید دستور سے بالا" ہوتی ہیں۔ یہ عاشق کا گلہ ہے جو وہ معشوق سے کرتا ہے۔ کیونکہ عاشق صادق اور معشوق حقیقی میں عشق و محبت کا رشتہ ہے ان راز و نیاز کی باتوں کو معترض کی سی ذہنیت رکھنے والا کیا جانیں جن کی الٹی سمجھ اس عشق و محبت کے رشتہ کو "جدائی اور انفاک" سے تعبیر کرتی ہے؟ ان بچاروں کو کیا معلوم کہ یہ جدائی "منطقیانہ انفکاک" کی جدائی نہیں بلکہ نے کی جدائی ہے۔ جس کی نسبت مولانائے روم فرماتے ہیں۔

بشنواز نے چُوں حکایت میکند

وز جدائی ہاشکایت میکند

حضرت مولانا مرحوم سچ فرماتے ہیں کہ

محرم ایں ہوش جُز بے ہوش نیست
مرزباں رامشتری چوُں گوش نیست

عاشق کے گلہ کی آواز معشوق حقیقی کے کانوں تک پہنچ جاتی ہے۔

بالفاظ مرحوم اقبال:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے۔
قُدسی الاصل ہے رفعت پہ نظر رکھتی ہے
خاک سے اٹھتی ہے گردوں پہ گذر رکھتی ہے
اڑکے آواز مری تابفلک جا پہنچی
یعنی اس گل کی مہک عرش تلک جا پہنچی

جب عاشق کی یہ "فریاد" عرش معلےٰ تک جا پہنچی تو اللہ کی رحمت نے اپنی قوم اسرائیل کی "سن لی" اوراس کو "رہائی بخشی۔ جس کی وجہ سے اسرائیل کی قوم اس کی مداح خواں ہو کر یہ مصمم ارادہ کر لیتی ہے کہ وہ اقوام عالم کو اپنے معبود حقیقی کی بشارت دے کر رہے گی۔(زبور ۲۲: ۲۱تا۳۱) پس زبور کا دوسرا حصہ معشوقِ حقیقی کی حمد وستائش پر مشتمل ہے۔

ہم معترضین کو تفسیر کا وہی سبق یاد دلاتے ہیں جو مرحوم مولوی صاحب نے مرزائیوں، نیچری مسلمانوں وغیرہ کو پڑھایا تھا۔ آپ نے ان کو یہ سبق دیا تھا" قرآن مجید عربی زبان میں آیا ہے اس لئے اس کے صحیح معنے اور صحیح تفسیر وہی ہو گی جو عربی زبان میں آیا ہے اس لئے اس کے صحیح معنی اور صحیح تفسیر وہی ہو گی جو عربی زبان (صرف ونحو، لغت وغیرہ) کے موافق ہو۔ یہ قرآن مجید کی خصوصیت نہیں۔ ہر زبان کا صحیح ترجمہ اور صحیح مطلب وہی ہوتا ہے جو اس زبان کے صحیح محاورات کے مطابق ہو۔ اس اصول میں عربی، فارسی، انگریزی وغیرہ سب مساوی ہیں۔ اس کے خلاف کا نام ہے تفسیر بالرائے یعنی جس تفسیر میں محض اٹکل پچو باتیں کی جائیں۔ ایسی تفسیر غلط اور بالرائے کہلاتی ہے "(تفسیر بالرائے صفحہ ۲)۔ تفسیر بالرائے نہ صرف غیر صحیح بلکہ حرام ہے۔(صفحہ ۵) ناظرین سے درخواست ہے کہ وہ مرحوم مولوی صاحب کا یہ فتویٰ یاد رکھیں۔

ناظرین نے دیکھ لیا ہو گا کہ ہماری تفسیر کی بنیاد عہدِ عتیق اور انبیائے سابقین کی زبان اور محاورات پر قائم ہے لہٰذا وہ صحیح ہے۔ لیکن مرحوم مولوی صاحب کی تفسیر محض تفسیر بالرائے ہے۔ پس وہ "اٹکل پچو باتیں" کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کے اپنے فتوے کے مطابق مرحوم کی تفسیر "نہ صرف صحیح بلکہ حرام ہے"

فصل دوم

آیہ زیرِ بحث اور ابنِ اللہ

سیدنا مسیح نے اس آیت کی تلاوت کیوں کی؟

سطور بالا میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ (۲۲) زبور میں ایک ایسے شخص کا شکوہ ہے جو یہ خیال کرتا ہے کہ ہمارے اعمال کی سزا اور جزا ہم کو اسی دنیا میں ملتی ہے۔ پس وہ متعجب ہو کر یہ پوچھتا ہے کہ ایک قوم جو راستباز اور خدائے واحد کی اکیلی پرستش کرنے والی ہے کیوں پستی اور ذلت کی حالت میں مبتلا ہے اور بُت پرست اقوام کیوں خوشحال ہیں۔ حالانکہ پستی اور زبونی (کمزوری) بُت پرستی کی سزا ہونی چاہیے اور عروج اور اقبال خدا پرستی کی جزا ہونی چاہیے۔

یہ ظاہر ہے کہ حضرت کلمتہ اللہ اس قسم کے اعتقادات کے قائل نہیں تھے ہمارے نیک و بد اعمال کی جزا اور سزا ہم کو فقط اسی دنیا میں مل جاتی ہے (یوحنا۹:۳ وغیرہ) پس جیسا ہم اوپر ثابت بھی کر چکے ہیں۔ (۲۲) زبور آپ کے اپنے روحانی تجربہ اور ذاتی روحانی حالت کا اظہار نہیں کرتا پس سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آنخداوند نے صلیب پر سے آیہ زیرِ بحث کی تلاوت کیوں فرمائی؟

مولوی ثناء اللہ صاحب بھی اپنی اخبار اہلِ حدیث میں یہی سوال پوچھتے ہیں اور فرماتے ہیں

> "سوال یہ ہے کہ مسیح نے صلیب پر جان دیتے ہوئے اسے کیوں پڑھا؟ قاعدہ یہ ہے کہ کوئی کلام سابق اس وقت پڑھا جاتا ہے جب کوئی شخص اپنی حالت کو اس کے مطابق سمجھے۔ جب تک کسی واقعہ کو گذشتہ واقعہ کے مماثل نہ قرار دیا جائے پہلے واقعہ پر بولا ہوا کلام دوسرے واقعہ میں نقل نہیں ہو سکتا۔ حضرت مسیح کا تکلیف کے وقت زیر بحث انجیلی فقرہ اپنے حال پر چسپاں کئے بغیر پڑھنا بالکل غیر موزوں ہو گا"۔

(اہل حدیث ۵ جون ۱۹۴۲ء)

جواباً عرض ہے کہ:

ہم اپنے رسالہ " اسرائیل کا نبی یا جہان کا منجی "؟ میں یہ ثابت کر چکے ہیں کہ اہلِ یہود کی صحفِ مقدسہ کے مطالعہ سے ہم پر عیاں ہو جاتا ہے کہ خدا نے قوم اسرائیل کو اس غرض سے چن لیا تھا کہ وہ اقوامِ عالم میں خدا کے علم اور نجات کی تبلیغ کرے۔

قسمت کیا ہر ایک کو قسام ازل نے
جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا

پس خدا نے قومِ یہود میں اس اصول کے تحت خاص طور پر اپنا علم ودیعت کر رکھا تھا اور اس کے سپرد یہ خدمت کی تھی کہ وہ دنیا کی تمام قوموں کو خدا کی معرفت بخشنے اور نجات کا پیغام دینے کا وسیلہ ہو۔ تاکہ تمام دنیا کی جملہ اقوام اہلِ یہود کے ذریعہ ایک حقیقی واحد خدا کے نور سے منور ہو جائیں (یسعیاہ ۴۲:۶ وغیرہ) قوم اسرائیل کے اس نصب العین کی وجہ سے منجی عالمین نے اپنے کام اور پیغام کو ایک حد تک اہلِ یہود میں ہی محدود

رکھا۔ آنخداوند کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ اس خفتہ (سوئی ہوئی) قوم کو بیدار کریں تا کہ اس کو اپنی ملی حیات کے اصلی نصب العین کا احساس ہو جائے اور وہ آپ کی انجیل پر ایمان لا کر دیگر اقوام عالم کو آپ کی نجات کی خوش خبری دینے کا وسیلہ بنے۔ اناجیل اربعہ کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ شروع شروع میں آنخداوند کو بڑی امید تھی کہ قوم اسرائیل آپ پر ایمان لے آئے گی (لوقا ۱۰ باب، یوحنا ۶: ۱، ۵ وغیرہ) لیکن تلخ تجربہ نے آپ کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ (مرقس ۲: ۲۰۔۸: ۲۷ تا ۲۸۔۹: ۳۰، ۳۲۔۱۰: ۳۲ تا ۳۴۔ متی ۲۳: ۲۹ تا ۳۶ وغیرہ) آپ محسوس کرتے تھے کہ بنی اسرائیل آپ کے حقیقی شاگرد ہو سکتے ہیں (یوحنا ۸: ۳۱ تا ۳۲) اور خود سچائی سے واقف ہو کر اور نجات حاصل کر کے اقوام عالم کی نجات کا باعث بن سکتے ہیں (یوحنا ۴: ۲۲) لیکن اس نجات سے فیض یاب ہونے کے بجائے اہل یہود کی بے اعتقادی اور بے ایمانگی روز بروز ترقی کرتی گئی (یوحنا ۸: ۲۷، ۴۶، ۱۰: ۲۵، ۲۶ وغیرہ) اور چونکہ خدا کی محبت ان میں نہیں تھی (یوحنا ۵: ۴۲) وہ خدا کے فرزند ہونے کے بجائے شیطان کے فرزند ہو گئے (یوحنا ۸: ۴۲) منجی عالمین کی قوم نے آپ کو رد کر دیا (متی ۲۱: ۳۳، ۴۵۔ ۲۲: ۵ تا ۸۔ مرقس ۱۲: ۱ تا ۱۰۔ لوقا ۱۴: ۱۶، ۲۴۔ ۲۰: ۹، ۱۷۔ یوحنا ۱: ۱۱۔ ۸: ۱۹، ۱۸: ۴۵ تا ۴۷ وغیرہ) اور وہ آنخداوند کو قتل کرنے کے درپے ہو گئے (یوحنا ۵: ۱۶ تا ۱۸۔ ۸: ۳۷۔ ۱۱: ۴۷ تا ۵۳)۔

کلمتہ اللہ کے دل میں اپنی قوم کے لئے تڑپ تھی۔ کیونکہ آپ کی محبت اہل یہود کے لئے غیر فانی تھی (متی ۲۳: ۳۷۔ لوقا ۱۳: ۳۴) آپ کے دل میں اس گردن کش قوم کے لئے جو خدا سے باغی تھے ایک درد تھا جو آپ کو چین لینے نہیں دیتا تھا۔ آپ اس قوم کی بے ایمانی پر بار بار نوحہ خواں ہوئے (متی ۱۷: ۱۷۔ ۸: ۱۲۔ ۱: ۱۵۔ ۱۲: ۴۱، ۴۳ لوقا ۱۱ باب وغیرہ)۔ آپ کی نگاہ ہمیشہ بنی اسرائیل کے ان گمراہ لوگوں پر تھی جو آپ کے خیال میں "ان بھیڑوں کی مانند جن کا کوئی چرواہا نہ ہو خستہ حال اور پراگندہ تھے" (متی ۹: ۳۶) بالخصوص اپنی زندگی کے آخر میں یہودی قوم کا خیال آپ کو ہر وقت ستاتا تھا (متی ۲۰: ۳۲۔ ۲۱: ۱۲ تا ۱۴۔ ۲۱: ۲۸ تا ۳۲۔ ۲۱: ۳۳، ۴۶۔ ۲۲: ۱۔ ۱۲۔ ۲۳: ۱۳، ۳۶، ۲۳: ۳۷ تا ۳۹ اور ۲۴ باب وغیرہ) ذرا خیال کرو کہ روئے زمین کی تاریخ میں ذیل کے حسرت ناک الفاظ اپنا ثانی کہیں رکھتے ہیں؟ منجی عالمین یہودی قوم کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔ "اے [1] یروشلیم۔ اے یروشلیم، تو جو نبیوں کو قتل کرتا اور جو تیرے پاس بھیجے گئے ان کو سنگسار کرتا ہے۔ کتنی بار میں نے چاہا کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے جمع کر لیتی ہے اسی طرح میں بھی تیرے لڑکوں کو جمع کر لوں۔ مگر تم نے نہ چاہا۔ دیکھو تمہارا گھر تمہارے لئے ویران چھوڑا جاتا ہے۔ کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اب سے مجھے پھر ہرگز نہ دیکھو گے جب تک نہ کہو گے کہ مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے" (متی ۲۳: ۳۷ تا ۳۹)۔ "جب وہ (مسیح) ہیکل (بیت اللہ) سے باہر جا رہا تھا تو اس کے شاگردوں میں سے ایک نے اس سے کہا۔ اے استاد۔ دیکھ یہ کیسے کیسے پتھر اور کیسی کیسی عمارتیں ہیں۔ یسوع نے اس سے کہا تو ان بڑی بڑی عمارتوں کو دیکھتا ہے؟ یہاں کسی پتھر پر پتھر باقی نہ رہے گا۔ جو گرایا نہ جائے" (مرقس ۱۳: ۱ تا ۲) "جب اس (یسوع) نے نزدیک آ کر شہر کو دیکھا تو اس پر رویا اور کہا کاش کہ تو اپنے [2] اسی دن میں سلامتی کی باتیں جانتا۔ مگر اب وہ تیری آنکھوں سے چھپ گئی ہیں۔ کیونکہ وہ دن تجھ پر آئیں گے کہ تیرے دشمن تیرے گرد مورچہ باندھ کر تجھے گھیر لیں گے اور ہر طرف سے تنگ کریں گے اور تجھ میں کسی پتھر پر پتھر نہ چھوڑیں گے اس لئے کہ تو نے اس وقت کو نہ پہچانا جب تجھ پر نگاہ کی گئی" (لوقا ۱۹: ۴۱ تا ۴۴)۔

---

[1] ناظرین نوٹ کریں کہ ان آیات میں بھی قوم یہود کے لئے صیغہ واحد استعمال کیا گیا ہے۔ (برکت اللہ)

[2] اس مقام میں بھی قوم یہود کے لئے صیغہ واحد استعمال کیا گیا ہے (برکت اللہ)

خنجر چلے کسی پر تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

منجی عالمین اپنی زندگی کے آخری ہفتے میں اہل یہود کی برگشتگی پر بار بار اظہارِ تاسف کرتے (متی ۲۳ باب) اور قوم اسرائیل کی قسمت پر روتے تھے۔ اس آخری ہفتہ کے شروع میں جب آپ یروشلیم تشریف لے گئے تو آپ نے ہیکل کو دیکھا جو یہود کی عبادت گاہ ہونی چاہیے تھی لیکن اس بدبخت قوم کے قائدین کی روحانیت کا یہ عالم تھا کہ:

ترک دنیا بمرود آموزند
خویشتن سیم وغلہ اندوزند

ان نام نہاد روحانی پیشواؤں کی حرص وآز (لالچ) نے بیت اللہ کو دعا کا گھر ہونے کے بجائے ڈاکوؤں کی کھوہ "بنا رکھا تھا (مرقس ۱۱: ۱۵تا۱۸) منجی عالمین کی غیرت کی آگ شعلہ زن ہوئی اور آپ نے "ہیکل میں داخل ہو کر ان سب کو نکال دیا جو ہیکل میں خرید وفروخت کر رہے تھے اور صرافوں کے تختے اور کبوتر فروشوں کی چوکیاں الٹ دیں اور ان سے کہا لکھا ہے کہ میرا گھر اقوام عالم کے لئے دعا کا گھر کہلائے گا مگر تم اسے ڈاکوؤں کی کھو بناتے ہو" (مرقس ۱۱: ۱۵) قسی القلب سردار کاہن خدا سے اس قدر باغی ہو گئے تھے کہ اپنی اصلاح کرنے کے بجائے الٹا ابن اللہ کو "ہلاک کرنے کا موقعہ ڈھونڈنے لگے" (مرقس ۱۱: ۱۸) قوم یہود اور اس کے باغی پیشواؤں کی روحانیت اس قدر گر چکی تھی کہ وہ چوروں، ڈاکوؤں اور بھیڑیوں کی طرح ہو گئے تھے (یوحنا ۱۰ باب) ان کی حالت بے پھل انجیر کے درخت کی مانند ہو گئی تھی (متی ۲۱: ۱۹) جس کا مقابلہ حضرت میکاہ نے اپنے زمانہ کے قوم یہود کے روحانی افلاس سے کر کے فرمایا تھا۔ کہ اس قوم میں راست باز شخص شاذونادر ہی ملتا ہے جس طرح بے پھل انجیر میں کوئی "گچھا نہیں ہوتا" (۷: ۱تا ۶۔ متی ۲۳ باب) آپ اپنی قوم کی بڑی بھیڑ دیکھتے تھے اور آپ کو لوگوں پر ترس آتا تھا" کیونکہ وہ ان بھیڑوں کی مانند جن کا چرواہا نہ ہو خستہ حال اور پراگندہ تھے" (متی ۹: ۳۶) اسی قسم کے خیالات ابن اللہ کے آخری ایام میں آپ کے دل میں مکذب اور مکفر قوم یہود کے روسا کی بابت لگاتار آرہے تھے جب آپ کوہ کلوری کو مصلوب ہونے کے لئے جارہے تھے تو "لوگوں کی ایک بڑی بھیڑ اور بہت سی عورتیں جو اس کے واسطے روتی پیٹتی تھیں اس کے پیچھے پیچھے چلیں" منجی عالمین نے جو الفاظ اپنی زبان صداقت بیان سے فرمائے وہ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ گو یہ سب گریہ وزاری۔ آہ ونالہ، بکاہ وفغاں آپ کی خاطر ہو رہا تھا تاہم اس نازک وقت میں بھی جب آپ صلیب کے بوجھ کے نیچے لڑک کھڑا رہے تھے آپ کو اپنا خیال مطلق نہیں تھا بلکہ قوم اسرائیل کے حشر کا خیال آپ کو ستا رہا تھا چنانچہ آپ نے ان عورتوں کو ارشاد فرمایا" اے یروشلیم کی بیٹیو! میرے لئے نہ روؤ بلکہ اپنے اور اپنے بچوں کے لئے روؤ۔ کیونکہ دیکھو وہ دن آتے ہیں جن میں کہیں گے مبارک ہیں وہ بانجھیں اور وہ رحم جو بار ور نہ ہوئے اور وہ چھاتیاں جنہوں نے دودھ نہ پلایا۔ اس وقت وہ پہاڑوں سے کہنا شروع کریں گے۔ کہ ہم پر گر پڑو اور ٹیلوں سے کہ ہمیں چھپالو۔ کیونکہ جب ہرے درخت کے ساتھ ایسا کرتے ہیں تو سوکھے کے ساتھ کیا کچھ نہ کیا جائے گا" (لوقا ۲۳: ۲۷تا ۳۱)۔ منجی عالمین کے یہ الفاظ حضرت ہوسیع نبی کے صحیفہ میں وارد ہوئے ہیں۔ جہاں یہ رسولِ قوم یہود کی روحانی پستی اور ذلت کا حال بیان کر کے اسرائیل کی قوم کی حالت پر واویلا کرتا ہے (۱۲: ۱تا۸)۔ یہ الفاظ ثابت کرتے ہیں کہ ایسے نازک وقت میں بھی جب لوگوں کی نظر ان کے اپنے دکھوں اور مصیبتوں پر قدرتی طور پر لگی ہوتی ہے ابن اللہ کی نگاہ اپنے مصائب اور اذیت پر نہیں بلکہ اپنی قوم کے روحانی افلاس اور پستی پر تھی۔ اور آپ قوم کی حالت دیکھ کر متاسف (افسوس کرنے والا) تھے۔

جب ہم کوہ کلوری کے باقی دو مصلوبوں کی حالت کا منجی عالمین کی حالت کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں تو یہ نمایاں فرق ہم پر فوراً ظاہر ہو جاتا ہے۔ ان کی نظر ان کے جسمانی عذاب اور سزا کی جانب لگی ہے لہٰذا وہ صلیب پر کراہ کراہ کر اور دوسروں پر لعنت کر کے جان توڑ رہے ہیں (متی ۲۷: ۴۴) لیکن منجی عالمین کی نظر آپ کے جسمانی دکھوں پر نہیں تھی بلکہ قوم اسرائیل کی سرکشی اور برگشتگی پر لگی تھی۔ جب آپ کے ہاتھوں میں کیل ٹھونکے جا رہے تھے۔ آپ نے قوم اسرائیل کے لئے دعائے مغفرت مانگی (لوقا ۲۳: ۳۴) جب آپ مصلوب ہوئے تو آپ کو صلیب کے جسمانی عذاب اور شرم کی پروانہ تھی (عبرانیوں ۱۲: ۲) بلکہ صلیب پر آپ کی نگاہ اپنی قوم بنی اسرائیل کے حسرت ناک انجام اور اس کے خوفناک مستقبل پر لگی تھی۔ آپ نے اپنے دل میں خیال فرما رہے تھے کہ اس قوم کا کیا حشر ہو گا جو خدا کے "انبیاء کو کوڑے مارتی۔ شہر بشہر ستاتی، سنگسار کرتی اور مصلوب اور قتل کرتی چلی آئی ہے (متی ۲۳: ۲۹ تا ۳۷) قوم اس کی روحانی پستی، اور زبونی کی حالت کو دیکھ کر ابن اللہ کو بائیسواں (۲۲) زبور یاد آیا۔ کیونکہ قوم یہود کی موجودہ حالت مزمور نویس کے زمانہ کی حالت جیسی ہو گئی تھی۔ پس آپ نے دونوں زمانوں کے قومی زوال میں مماثلت دیکھ کر اپنی زبانِ صداقت بیان سے بڑی آواز سے چلا کر کہا۔ ایلی۔ ایلی۔ لما شبقتنی یعنی اے قوم اسرائیل کے خدا۔ اے قوم اسرائیل کے خدا تو نے اپنی قوم کو کیوں چھوڑ دیا؟ تو نے اس قوم کے سپرد یہ کام کیا تھا کہ تیرے نام اور نجات کو دنیا کی کل اقوام تک پہنچائے۔ لیکن یہ قوم نہ صرف اپنے فرض ادا نہیں کرتی بلکہ تیرے مسیح کو بھی مصلوب کر رہی ہے۔ اے باپ تو اس قوم کو معاف کر کیونکہ اس قوم کے لوگ نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں (لوقا ۲۳: ۳۴۔ متی ۲۷: ۴۶ وغیرہ)۔

اناجیل اربعہ کا مطالعہ ظاہر کر دیتا ہے کہ آنخداوند کو مزامیر حفظ تھے۔ اگر آپ کو اپنے دکھوں اور اذیتوں ہی کا خیال ہوتا تو آپ دیگر زبوروں کی تلاوت فرما سکتے تھے۔ جو جسمانی اذیت اور عقوبت کے وقت ان کی اپنی تسلی کا باعث ہو سکتے تھے۔ مثلاً آپ جانکنی کے موقعہ پر زبور ۲۳: کے الفاظ کو دہرا سکتے تھے۔ "خداوند میرا چوپان ہے۔۔۔۔ مجھے کمی نہ ہو گی۔۔۔۔ بلکہ خواہ موت کے سایہ کی وادی میں سے میرا گزر ہو میں کسی بلا سے نہیں ڈروں گا کیونکہ تو (اے خداوند) میرے ساتھ ہے۔۔۔۔ میں ہمیشہ خداوند کے گھر میں سکونت کروں گا"۔ لیکن حضرت ابن اللہ نے نہ تو اس زبور کی اور نہ اس قسم کے کسی دوسرے زبور کی صلیب پر سے تلاوت فرمائی کیونکہ منجی عالمین کو صلیب پر اپنے جسمانی عذاب کا خیال تک نہ تھا بلکہ آپ کو اپنی قوم کے عبرت ناک حشر کا خیال دامنگیر تھا۔ چونکہ ابن اللہ مجسم محبت تھے اور محبت اپنی خودی پر دھیان نہیں کرتی (۱ کرنتھیوں ۱۳: ۵) پس ابنِ اللہ صلیب پر اپنے دکھوں پر نہیں۔ بلکہ قوم اسرائیل کے حسرت ناک انجام کا خیال فرما رہے تھے۔ مقدس پولوس رسول اس عجیب ماجرے سے متاثر ہو کر فلپیوں کی کلیسیا کو نصیحت کر کے فرماتا ہے۔ "ہر ایک اپنے ہی احوال پر نہیں بلکہ ہر ایک دوسرے کے احوال پر بھی نظر رکھے۔ ویسا ہی مزاج رکھو جیسا مسیح یسوع کا بھی تھا" (فلپیوں ۲: ۴ تا ۵) منجی عالمین نے موت کی تلخی اور جان کنی کی حالت میں اپنا خیال نہ کیا (رومیوں ۱۵: ۳) اور "اپنے احوال پر نظر" نہ کی بلکہ قوم اسرائیل کا حشر اور مستقبل آپ کی نظروں کے سامنے تھا (جس طرح گزشتہ زمانہ میں وہ مزمور نویس کے سامنے تھا) پس مزمور نویس کے ہم خیال ہو کر آپ نے اس کے الفاظ کو دہرایا اور آیہ زیر بحث کی تلاوت کر کے فرمایا "ایلی۔ ایلی۔ لما شبقتنی" چنانچہ آبائے کلیسیاء میں سے ایک بزرگ لکھتا ہے[1]۔

[1] Commentary on St. Mark (Collection of the works of Fathers. By. Thomas Aquinas)

"اس کا مطلب یہ تھا کہ تونے قوم اسرائیل کو کیوں چھوڑ دیا کہ وہ تجھ سے اس حد تک برگشتہ ہوگئی ہے کہ تیرے بیٹے کو مصلوب کر رہی ہے"۔

ادھر منجی عالمین کو اہل یہود کی برگشتگی کی وجہ سے (زبور ۲۲: ۱) یاد آئی۔ اور ادھر یہودی قوم کے زعماء اور قائدین اسی زبور کے الفاظ (زبور ۲۲: ۷، ۸) میں ابن اللہ کا مضحکہ کر رہے تھے۔ چنانچہ انجیل متی میں وارد ہے کہ "سردار کاہن بھی فقیہوں اور بزرگوں کے ساتھ مل کے ٹھٹھے سے کہتے تھے۔ اس نے اوروں کو بچایا۔ اپنے تئیں نہیں بچا سکتا۔ اس نے خدا پر بھروسہ کیا ہے۔ اگر وہ اسے چاہتا ہے تو اب اس کو چھڑا لے" (زبور ۳۷: ۴۱ تا ۴۳، لوقا ۲۳: ۳۵) ابنِ اللہ کا دل اہل یہود کی بے اعتقادی کے باعث پہلے ہی چھنا پڑا تھا۔ ان الفاظ نے دل کے زخم پر نمک پاشی (نمک چھڑکنا ،تکلیف دینا) کا کام کیا۔ کیونکہ اب اس قوم کے سردار کاہن تک خدا پر بھروسہ رکھنے کو الٹا ایک طعنہ کا امر قرار دے رہے تھے۔ حالانکہ ان کا فرض منصبی یہ تھا کہ ایسی حالت میں لوگوں کو خدا پر بھروسہ رکھنے کی تلقین کرتے۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

پس آنخداوند نے "بڑی آواز سے چلا کر فرمایا" اے بنی اسرائیل کے خدا۔ اے بنی اسرائیل کے خدا تونے قوم اسرائیل کو کیوں چھوڑ دیا ہے کہ اس کے سردار کاہن تک تجھ سے اس قدر باغی ہوگئے ہیں کہ تجھ پر بھروسہ رکھنا بھی معیوب بات خیال کرتے ہیں اور تیرے مسیح کو ملعون گردانتے ہیں؟ (مقابلہ کرو زبور ۶۹: ۹ وغیرہ)۔

سردار کاہنوں نے صرف طعنے دینے پر ہی اکتفانہ کی بلکہ انہوں نے (زبور ۲۲) کی مختلف آیات میں جن مصائب وآلام کا ذکر ہے ان کا آپ کو نشانہ بنا کر چھوڑا تاکہ حد یکہ صلب پر آپ کی بیرونی اور خارجی حالت عین اس زبور کے مصداق ہوگئی۔ مثلاً صلیب پر آپ کے مبارک ہاتھوں اور پاؤں کو چھیدا گیا (زبور ۲۲ آیت ۱۶۔ مرقس ۱۵: ۱۳، ۱۴، ۲۴) صلیب پر آپ کے جسم اطہر اور ہڈیوں کو کھینچا اور تانا گیا۔ (آیت ۱۴، متی ۲۷: ۳۵) آپ کے کپڑوں پر قرعہ ڈالا گیا۔ (زبور ۲۲: ۱۸، ومرقس ۱۵: ۲۴؛ یوحنا ۱۹: ۲۳، ۲۴) آپ کی اذیت کی حالت میں آپ کو تاکا اور گھورا گیا۔ (زبور ۲۲: ۱۷؛ متی ۲۷: ۴۳۔ لوقا ۲۳: ۳۴، ۳۵) آپ کے دشمنوں نے آپ کو دلخراش طعنے سنائے (زبور ۲۲: ۷، ۸؛ متی ۲۷: ۳۹ تا ۴۴)۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب باتیں ایسی تھیں کہ قدرتی طور پر آنخداوند کے ذہن میں (زبور ۲۲: ۱) آئی اور آپ نے اس کی تلاوت فرما کر قوم یہود کی برگشتگی پر اظہارِ تاسف فرمایا اور کہا۔ اے قوم اسرائیل کے خدا۔ اے قوم اسرائیل کے خدا۔ تونے قوم اسرائیل کو کیوں چھوڑ دیا؟"۔

منجی عالمین کی جو بیرونی حالت صلیب پر تھی اس کی مطابقت اس زبور کے ساتھ اس حد تک ہے کہ آبائے کلیسیاء میں سے ایک بزرگ ٹرٹولین[1] کہتا ہے کہ

"یہ زبور مسیح کے دکھوں پر مشتمل ہے"۔

دورِ حاضرہ میں بھی مسیحی کلیسیا اس کو مبارک جمعہ کے روز پڑھتی ہے جب وہ منجی عالمین کی مبارک موت کی یادگاری کرتی ہے اور عبرانیوں کے خط کا مصنف آیات ۲۲ تا آخر کا اطلاق ابن اللہ پر کرتا ہے۔ کیونکہ یہ زبور امید اور محبت کے الفاظ پر ختم ہوتا ہے (۲ باب)۔

[1] Ad Marcion iii

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ اس زبور کی کسی آیت میں بھی (زبور ۵۱) کی طرح گناہ کا اقرار موجود نہیں۔ اور نہ اس کی کسی آیت میں دشمنوں پر لعنت کی گئی ہے پس اگر حضرت کلمتہ اللہ نے اپنی جانکنی کی حالت میں تمام کے تمام مزمور کی تلاوت کی بھی ہو تو جائے تعجب نہیں۔ کیونکہ آپ کو یہ احساس تھا کہ اس مزمور اور یسعیاہ نبی کے صحیفہ کے "خادم یہوواہ" اور کتاب (حکمت ۱۲:۱۲ تا ۲۰) آیات میں راستباز کے جن دکھوں کا ذکر ہے وہ آپ کی ذاتِ قدسی صفات میں بدرجہ احسن پورے ہو رہے ہیں۔

ہم نے مرحوم مولوی صاحب کے سوال کا تشفی بخش جواب صحیح اصولِ تفسیر کے مطابق دینے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ تمام متلاشیانِ حق پر اب واضح ہو گیا ہو گا کہ منجی کونین نے صلیب پر جان دیتے ہوئے آیہ زیر بحث کو کیوں پڑھا؟ اس آیہ شریفہ کی مندرجہ بالا تاویل صرف صحیح اصول تفسیر پر مبنی ہے۔ یہ تفسیر مزمور نویس کے خیالات کا صحیح نقشہ ہے اور ۲۲ ویں زبور کے قرائن اور سباق وسیاق اس کے حامی ہیں۔ یہ تفسیر آنخداوند کے خیالات، کلمات اور جذبات اور معتقدات کے مطابق ہے اور آپ کی روحانی حالت اور تجربہ۔ آپ کا حقیقی منشا اور مطلب آپ کا پروگرام اور طرزِ عمل سب اس تفسیر کی تصدیق کرتے ہیں۔ کتب مقدسہ کی زبان، الفاظ اور محاورات سے اس کی تائید ہوتی ہے اور انجیل جلیل کی آیات محکمات جن کا فکر باب دوم میں کیا گیا ہے اس تفسیر کی موید (معاون، مدد کرنے والا) ہیں۔ پس ہماری مرحوم کی تاویل کی طرح تفسیر بالرائے نہیں ہے۔ بلکہ صحیح تفسیر ہے جو صرف صحیح اصول پر مبنی ہے۔

اختلافِ قرات

مولوی ثناء اللہ صاحب باوجود دعویٰ ہمہ دانی (صفحہ ۳۸) مسیحیت کی کتُب مقدسہ سے اس درجہ نابلد (ناواقف) ہیں کہ ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ کتُب کس زبان میں لکھی گئیں تھیں۔ اور مناظر ہونے کے باوجود وہ بچارے ان زبانوں سے بھی آشنا نہیں۔ پس ہم ان سے یہ امید نہیں کر سکتے کہ وہ انجیل کی مختلف قراتوں اور ترجموں سے واقف ہوں۔ ہم ناظرین کی واقفیت کی خاطر آیت زیرِ بحث کی مختلف قراتوں کا ذکر کرتے ہیں۔

(الف۔) آرامی قرات۔ ہم باب دوم میں بتلا چکے ہیں۔ کہ آنخداوند کی مادری زبان آرامی تھی۔ پس اصل انجیل جو اس زبان میں لکھی گئی تھی وہ کلمتہ اللہ کے کلمات طیبات پر خاص طور پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس انجیل میں یہ آیہ شریفہ یوں ہے [1]۔

"اے میرے خدا۔ اے میرے خدا۔ میں اس گھڑی کے لئے پیدا ہوا تھا"۔

یہ ظاہر ہے کہ مولوی صاحب کا اعتراض اس قرات پر سرے سے وارد نہیں ہو سکتا۔ اس قرات کے ساتھ (یوحنا ۱۲:۲۷) کے الفاظ کا مقابلہ کرو:

(ب۔) "اے میرے خدا۔ اے میرے خدا۔ تو نے مجھے کیسا جلال بخشا۔"

(ج۔) "اے میرے خدا۔ اے میرے خدا۔ تو نے مجھے کیوں رسوا ہونے دیا۔"

مذکورہ بالا دونو قرائیتں کتاب Mission and Message of Jesus کے صفحہ ۱۹۶ پر درج ہیں آپ کا اعتراض ان دونوں قراتوں پر بھی وارد نہیں ہو سکتا۔

(د۔) ایک اور قرات ہے جو یہودی عالم ڈاکٹر مونٹی فیوری مرحوم (Montefiore) نے اپنی تفسیر اناجیل ثلاثہ پر لکھی ہے اور وہ یہ ہے۔

[1] See Lam sa, the Four Gospels.

"اے میرے خدا۔ اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں طعن اور تشنیع کا نشانہ ہونے دیا"۔

مرحوم لکھتے ہیں کہ اس قرات کو جرمن نقاد ڈاکٹر ہارنیک درست تسلیم کرتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مولوی صاحب کا اعتراض اس قرات پر وارد نہیں ہوتا۔ (ہ۔) "اے میرے خدا۔ اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا"؟ ہم نے سطور بالا میں ثابت کر دیا ہے کہ مولوی صاحب کا اعتراض جو آپ نے اس قرات پر کرتے ہیں باطل ہے کیوں کہ آپ نے اس اعتراض کرنے میں ہر صحیح اصولِ تفسیر کو طاقِ نسیاں (بھول جانا) پر رکھ دیا ہے۔

چوں بشنوی سخن اہلِ دل مگو کہ خطاست
سخن شناس نہ دلبرا خطا ایں جاست

آیہ زیرِ بحث اور مسئلہ کفارہ

مرحوم ثناء اللہ نے اپنے اعتراض میں جو اس رسالہ کے باب اول میں نقل کیا گیا ہے۔ آیہ زیر بحث "ایلی۔ ایلی۔ لما شبقتنی کو مسئلہ کفارہ سے متعلق کیا ہے۔

ہمیں اس بات پر تعجب آتا ہے کہ آپ جیسے کہنہ مشق اور سال خوردہ مصنف نے کس منطق کی رو سے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ آیت مسئلہ کفارہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس آیت میں بلکہ سیاق وسباق کی پوری عبارت اور باب میں گناہ یا گناہ کے بوجھ کا یا کفارہ کا ذکر تک نہیں ملتا۔ اگر یا بالفرض محال مولوی صاحب کے اعتراض کو ایک لمحہ کے لئے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ "خدا نے مسیح کو ترک کر دیا تھا"۔ تو بھی ہم کو کہیں اس بات کا نام ونشان نظر نہیں آتا کہ اس کے ترک کر دینے کا باعث دنیا کی نافرمانی اور گناہ تھا اور کہ خدا باپ نے اپنے بیٹے کو جہان کے گناہ کی سزا یوں دی کہ اس کو "چھوڑ دیا"۔ اگر آپ کا یہ خیال ہے تو آپ مسیحی کفارہ کا مفہوم سرے سے نہیں سمجھے۔ مسیحی عقیدہ یہ نہیں ہے کہ مسیح کو صلیب پر دنیا کے گناہوں کی سزا ملی بلکہ کفارہ کا عقیدہ یہ ہے کہ "مسیح ہمارے گناہوں کے لئے موا" (۱۔ کرنتھیوں ۱۵: ۳)۔ "مسیح بے دینوں کی خاطر موا"۔ جب ہم گنہگار ہی تھے۔ مسیح ہماری خاطر "موا"۔ "خدا سے اس کے بیٹے کی موت کے وسیلے سے ہمارا میل ہو گیا" (رومیوں ۵: ۶، ۸، ۱۰ وغیرہ)۔ ان دونوں باتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لیکن معترض "دنیا کے نور" کی دشمنی میں روشنی سے دور جا پڑے ہیں۔

اگر اس آیہ شریفہ کا تعلق مسئلہ کفارہ سے ہوتا تو مقدس پولوس یا مقدس پطرس یا مقدس یوحنا یا انجیلی مجموعہ میں سے کوئی مصنف تو اس کو اپنی مختلف تحریروں یا تقریروں میں مسئلہ کفارہ کے ثبوت میں پیش کرتا۔ انجیل جلیل کی کُتب مقدسہ میں سے کتاب اعمال الرسل اور مکتوبات کی ایک ایک سطر پڑھ لو تم کو اس قسم کا کوئی فقرہ یا کلمہ نہیں ملے گا۔ جس سے اس باطل نتیجہ کو تقویت مل سکے۔ ان سب کی معنی خیز خاموشی یہ ثابت کر رہی ہے کہ آیہ زیر بحث کا مسئلہ کفارہ کے ساتھ دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ جب معترض کے استدلال کی بنیاد انجیل جلیل کی کسی ایک آیت پر بھی نہیں تو ان کی ضد اور ہٹ دھرمی میں کیا شک رہ گیا۔ ھاتو برھانکم ان کنتم صادقین۔

آیہ زیر بحث اور مسئلہ تجسم

ہم نے باب اول میں مولوی صاحب کے اعتراضات کو نقل کیا ہے کہ جو آپ نے اس آیہ شریفہ پر کئے ہیں۔ آپ اپنی کتاب "اسلام اور مسیحیت" میں بڑے طمطراق (شان وشوکت، غرور) کے ساتھ کہتے ہیں۔

> "ہم پادری برکت اللہ صاحب اینڈ پارٹی اوران کی معرفت کل مسیحی دنیا سے سوال کرتے ہیں کہ انجیل متی کا یہ فقرہ کہ "مسیح نے صلیب پر چلا کر جان دی"۔ اس چلا کر جان دینے کے وقت بھی مسیح مجسم خدا تھا یا نہیں اوراس میں اور خدا میں کوئی مغائرت تو نہ تھی پھر چلا کر جان کس نے دی؟ یہاں پہنچ کر ہم تو رک جاتے ہیں آپ ہی بتائیے کہ وہ کون تھا؟
>
> ع "اگر تم زبان سوز"

(صفحہ ٦٦)

ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ مولوی صاحب یہ خیال کرتے ہیں کہ مسیحی عقیدہ یہ ہے کہ نعوذ باللہ خدا مصلوب کیا گیا۔ اعتراض ظاہر کرتا ہے کہ یہ بیچارے نرے مولوی ہی ہیں اور مسیحی عقائد کے علم اور تاریخ سے بالکل کورے ہیں۔ ان کو کیا معلوم کہ انیس سو سال سے جمہور کلیسیائے جامع نے اس قسم کے نظریہ کو کفر قرار دے دیا ہوا ہے۔ مولانا نے مسئلہ تجسم اور الوہیت مسیح کو سمجھا ہی نہیں۔ ہم نے مانا کہ آپ ان مسائل کو نہیں مانتے لیکن آپ کو ان مسائل (جن پر آپ اعتراض کرتے ہیں) کے سمجھنے کی کم از کم کوشش تو کرنی چاہیے۔ آپ میری کتابوں کو جہاں اس مسائل کا ذکر کیا گیا ہے غور سے دوبارہ پڑھیں تب آپ پر واضح ہو جائے گا کہ یہ اعتراض مسیحیت پر سرے سے وارد ہی نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں ہم معترضین کی توجہ بالخصوص اپنی کتاب توضیح العقائد کے پہلے چند ابوب کی جانب مبذول کرتے ہیں۔

اگر مرحوم نے میری کتاب "دین فطرت۔ اسلام یا مسیحیت" اور رسالہ مسیحیت کی عالمگیری" (جن کا جواب وہ لکھنے بیٹھے تھے) بغور مطالعہ کیا ہوتا تو ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ہم کس معنی میں خدا کو "غالب علی الکل یا قدرتوں اور طاقتوں کا مالک مانتے ہیں۔ وہ خود دیکھ لیتے کہ ان کا یہ مایہ ناز اعتراض (جس کا بتکرار اعادہ کیا جاتا ہے) بالکل بے معنی رہ جاتا ہے لہٰذا ہم آپ کی توجہ پھر اول الذکر کتاب کے صفحہ ۳۴ اور موخر الذکر کتاب کے صفحہ ۳۱ کی طرف مبذول کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ عاقل را اشارہ کافی است۔ ہم نے ان کی کتاب میں بہتیرا ڈھونڈا کہ کہیں انہوں نے ان صفحوں کے مضمون پر کچھ لکھا ہو۔ لیکن آپ نے ہر جگہ اس اہم اور بنیادی نکتہ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان سے اس کا کوئی جواب بن نہیں پڑا اور یا "طبعیت کی کمزوری اور عوارض (عارضہ کی جمع، بیماریاں، دکھ، مرض) کی کثرت" نے ان کو اپنے مخاطب کے نظریہ کو یہ سمجھنے کی فرصت نہیں دی تھی۔

اگر کتاب "اسلام اور مسیحیت" خاکسار کی کتابوں کے جواب میں لکھی گئی تھی تو پھر کیا وجہ ہے کہ مولوی صاحب نے ان اہم مسائل کفارہ اور تجسم کا ذکر کرتے وقت ہماری تصنیف کردہ کتابوں کو نظر انداز کر کے دیگر مناظرین کی کتُب کو لے کر ان پر مفصل بحث کی ہے؟ مثلاً الوہیت مسیح کی بحث میں آپ نے ایک قدیم مسیحی گیت پر (جو ڈیڑھ ہزار سال ہوئے لکھا گیا تھا اور جس کا ذکر تک میری کتُب میں نہیں آتا) بحث کی ہے۔ (صفحہ ۵٦ تا ۵۷) اور پادری فنڈر کی کتاب میزان الحق مطبوعہ ۱۸۹۲ء کا (صفحہ ۵۹) پادری ہیئرس کی کتاب کا (صفحہ ۵٦ تا ۵۷) رئیس المناظرین پادری عبد الحق صاحب کے رسالہ

اثبات التثلیث کا(صفحہ ۶۱تا۶۳، ۲۰۱وغیرہ)رسالہ اخوت کا(صفحہ ۶۵)مرحوم ڈپٹی عبداللہ آتھم صاحب کی جنگ مقدس کا(صفحہ ۶۷)اقتباس کر کے ان کی عبارتوں پر اعتراض کئے ہیں۔ اسی طرح کفارہ کی بحث میں آپ نے پادری گولڈ سیک کی کتاب (صفحہ ۱۲۰تا۱۲۱)رسالہ المائدہ کا صفحہ (۱۲۳) مرحوم پادری ٹامس ہاول کی کتاب کا(صفحہ ۱۲۳تا۱۲۴)کا ذکر کے ان پر اعتراض کئے ہیں اور پھر خاکسار سے ان کے جواب کا مطالبہ کرتے اور مجھے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ

"پادری برکت اللہ صاحب۔بقول گونگے کی بولی گونگے کی ماں سمجھے آپ ہی بتلایئے وغیرہ وغیرہ"

"صفحہ ۱۲۴"

پادری گولڈ سیک کا یہ قول پادری برکت اللہ صاحب کو بھی مسلم ہونا چاہیے۔ اس لئے اب پادری صاحب ہمارے سوالات ٹھنڈے دل سے سن کر ان پر غور کریں وغیرہ وغیرہ "صفحہ ۱۲۰" پادری عبدالحق صاحب چونکہ منطقی تقریر کیا کرتے ہیں۔ اس لئے ہم ان سے پوچھنا چاہتے ہیں وغیرہ وغیرہ "(صفحہ ۶۱)۔

ناظرین خدارا آپ ہی بتلایئے مولوی صاحب ان اصحاب کا جواب لکھنے بیٹھے تھے یا خاکسار کی کتابوں کا جن کو آپ نے کفارہ اور تجسم کی بحث کے دوران میں بالکل نظر انداز کر دیا ہے؟ آپ تو ہم کو آدابِ مناظرہ سکھانے چلے تھے(صفحہ ۱۲، ۱۴، ۱۵)کیا مناظرہ اور مباحثہ کے آداب یہی ہیں؟ اگر آپ ہماری کتُب کو نظر انداز نہ کرتے تو ہم کو آپ سے ان کو دوبارہ بغور مطالعہ کرنے کی ناگوار درخواست نہ کرنا پڑتی۔ اور اگر آپ نے میری دیگر کتُب کو بھی دیکھ لیا ہوتا تو آپ کو اپنی "عمر کی آخری منزل" میں چند ایک بوسیدہ اعتراضات کو اپنی کتاب میں بار بار دہرانے کی ضرورت نہ پڑتی۔ مثلاً اگر آپ نے میرا رسالہ "اسرائیل کا نبی یا جہان کا منجی"؟ (جس کا ذکر میں نے "مسیحیت کی عالمگیری" کے دیباچہ میں کیا تھا)دیکھا ہوتا تو آپ (مرقس ۷: ۲۴تا۳۰اور متی ۱۵: ۲۱تا۲۸)پر اعتراض کرنے کی بار بار زحمت نہ اٹھاتے (صفحہ ۲۲، ۱۵۷و۲۰۵وغیرہ) پھر اگر آپ نے میری کتاب "کلمتہ اللہ کی تعلیم" (جس کا ذکر "مسیحیت عالمگیری" کے دیباچہ (صفحہ ۶) میں کیا گیا ہے) پڑھا ہوتا۔ تو آپ کو مسیحیت اور شریعت پر بار بار بحث نہ کرنا پڑتی (صفحہ ۱۳، ۸۸تا۹۲، ۱۳۷وغیرہ)۔

مولوی صاحبان سے اپیل

ہم نے مولوی ثناء اللہ صاحب اور ان کے ہم خیالوں کو آیہ زیر بحث کی صحیح تفسیر سنا کر ان پر اتمام حجت کر دی ہے پس ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ہم ان سے پھر ایک بار اپیل کریں کہ وہ اس ادبی، تضحیک اور توہین کے لئے اور ان ناسزا کلمات کے لئے جو انہوں نے حضرت کلمتہ اللہ وروح اللہ کے حق میں اپنی من گھڑت تاویل کے زیر اثر روا رکھتے ہیں بارگاہِ ایزدی میں خشوع وخضوع (عاجزی) کے ساتھ توبہ کر کے خدا سے معافی کے طلبگار ہوں۔ روزِ حشر جس خدا کے سامنے وہ جائیں گے وہ ان کو مخاطب کر کے تنبیہ کرتا ہے:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ أَنَّى يُصْرَفُونَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِالْكِتَابِ وَبِمَا أَرْسَلْنَا بِهِ رُسُلَنَا فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ إِذِ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلَاسِلُ يُسْحَبُونَ فِي الْحَمِيمِ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُونَ

ترجمہ: یعنی کیا تم نے ان لوگوں کے حال پر نظر نہیں کی جو خدا کی آیتوں میں جھگڑے نکالا کرتے ہیں کدھر کو بہکے چلے جا رہے ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو کتاب جو جھٹلاتے ہیں اور ان کتابوں اور صحیفوں کو بھی جھٹلاتے ہیں جو ہم نے اپنے رسولوں اور نبیوں کی معرفت بھیجے ہیں۔ سو آخر کار ان کو اس جھٹلانے

کا نتیجہ معلوم ہو جائے گا۔ جب کہ طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے۔ اور طوق کے علاوہ زنجیریں۔ پانی پلانے کے لئے گھسیٹتے ہوئے ان کو جلتے پانی میں لے جائیں گے۔ پھر آگ میں جھونکنے جائیں گے۔ (سورہ مومن آیات ۷۳ تا ۷۵)۔

مولوی صاحب نے فرمایا ہے "یہودی مسیح کے حق میں اپنی ناراضگی کا اظہار ایسے سنگین لفظوں میں کرتے تھے کہ ع

"اگر گویم زباں سوزہ"

صفحہ ۳۹۔

لیکن اس پر بھی آپ نے ناشائستہ الفاظ اپنے قلم سے نکالے۔ آپ نہ صرف یہود کے "سنگین لفظوں" کو بلکہ مرزائے قادیانی کو بھی (جو بقول آپ کے " دُرشت کلامی میں مہارت نامہ رکھتے تھے"۔ اہلِ حدیث ۱۵ مئی ۱۹۴۲ء مات کر گئے۔ کیونکہ جہاں تک ہم کو ان کی تصنیفات پڑھنے کا ناگوار اتفاق ہوا ہے سب نے اپنے اعتراضات کو "الفاظ کی شکل" (صفحہ ۱۰۷) تک ہی محدود رکھا تھا۔ کسی کے ہذیان نے آپ کی طرح اس سے تجاوز کر کے ایک گھنونی "تصویر کی شکل" (صفحہ ۱۰۷) اختیار نہ کی تھی۔

ہم پیروی قیس نہ فرہاد کریں گے

ہم طرزِ جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

مولوی صاحب نے اپنی کتاب "اسلام اور مسیحیت" میں مسیح مصلوب کی ایک نہایت بھونڈی اور دل آزار تصویر شائع کی تھی (صفحہ ۱۰۹) جس پر ہم نے اخبار اُخوت لاہور میں صدائے احتجاج بلند کی تھی۔ لیکن مولوی ثناء اللہ صاحب اپنے شرمناک فعل پر نادم ہونے کے بجائے

"عذر گناہ اور بدتر از گنا" نہایت بے باکی سے فخریہ کہتے ہیں "اس تصویر میں مسیح کو مولویانہ شکل میں دکھایا گیا ہے۔ مثلاً داڑھی گھنی، مونچھیں شرعی اور سر پر بال رکھے ہوئے اچھی صالحانہ شکل نظر آتی ہے۔"

(اہل حدیث ۲۶ فروری جون ۱۹۴۲ء)

قادیانیوں نے بدیں خیال کہ مبادا مولوی ثناء اللہ مسیح کی توہین میں ہم سے سبقت لے جائے قادیان کے سرکاری گزٹ الفضل میں اس کو شائع کر دیا کیونکہ بحکم اھل بیت اعرف فی البیت (گھر والے گھر کی بات جانتے ہیں) یہ دونوں ایک دوسرے کے باطن سے واقف ہیں۔ اس طرز عمل سے دونوں اخباروں کے ایڈیٹروں نے اس مکروہ حرکت سے اپنا اور دیگر نام نہاد مسلمانوں کا دل خوش کر کے حضرت روح اللہ سے قساوت (بے رحمی) قلبی کا ثبوت دے دیا۔

مولوی ثناء اللہ صاحب بھول گئے کہ انگریزی ہفتہ وار اخبار پیرسن نے اپنی ۱۰ فروری ۱۹۳۴ء کی اشاعت میں رسول عربی، بی بی عائشہ اور بلال کی تصاویر شائع کی تھیں جس پر ہندوستان کے طول و عرض میں کہرام مچ گیا تھا۔ تمام اسلامی جرائد نے (جس میں آپ بھی شامل تھے)۔ قیامت صغریٰ برپا کر دی تھی۔ اس واویلا کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ گورنمنٹ نے اس اخبار کے مضمون کو ضبط کر لیا تھا۔ کیونکہ اس سے مسلمانوں کے دل مجروح ہوئے تھے۔ لیکن مسیحی کلیسیا عوام الناس میں زبردست ہیجان اور بے چینی پیدا کر کے گورنمنٹ سے سزا کا مطالبہ کرنے کا وطیرہ اختیار نہیں کرتی۔

لطیف طبع کو لازم ہے سوزِ غم بھی لطیف
بلند آتش کل کا کبھی دھواں نہ رہا

ہم اپنے آقا اور مولا ربنا المسیح کے اسوہ حسنہ پر چل کر مرحوم مولوی ثناء اللہ صاحب اور آنجہانی مرزائے قادیانی کی زیارت کے حق میں خدائے غفور الرحیم کی بارگاہ میں دست بدعا ہیں کہ خدا ان سب کو معاف فرمائے اور وہ قعرِ مذلت سے نکل کر نجات ابدی حاصل کریں۔ آمین ثم آمین۔

مرحوم مولوی ثناء اللہ صاحب حدیث کی حجیت کے قائل اور امام بخاری کے پجاری تھے۔ امام صاحب کی صح الکتب بعد از کتاب اللہ کے چوبیسویں پارہ کتاب اللباس میں چودہ حدیثیں موجود ہیں جن میں تصویروں کی مذمت اور تصویر بنانے والوں کی سخت سزا کا ذکر ہے جس کو پڑھ کر بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لکھا ہے کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا کہ "جس گھر میں کتا ہو یا تصویریں ہوں وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے"۔ اور کہ "جو لوگ تصویریں بناتے ہیں قیامت کے روز ان کو عذاب دیا جائے گا"۔ عبد اللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ "میں نے رسول اللہ سے سنا کہ سب سے زیادہ سخت عذاب قیامت کے دن تصویریں بنانے والوں کو دیا جائے گا"۔ مولوی صاحب نے تو یہ خیال کیا تھا کہ یہ مکروہ تصویر ان کی "نجات کا ذریعہ" ہو گی (صفحہ الف) لیکن مندرجہ بالا احادیث کی رو سے وہ جہنم کے شدید ترین عذاب کے مستحق ہو گئے۔ اس قسم کے ذوو الجہین قرآن وحدیث سے منحرف ہو کر یہ خیال نہ کریں کہ وہ مواخذہ خداوندی سے چھوٹ جائیں گے۔ چنانچہ عبد اللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ "ایک مرتبہ جبرائیل نے حضرت سے آنے کا وعدہ کیا اور بہت دیر ہو گئی۔ رسول خدا کو بڑا انتظار ہوا۔ آخر کار آپ گھر سے باہر نکلے تو وہاں جبرائیل ملے۔ آپ نے دیر سے آنے کی شکایت کی۔ جبرائیل نے کہا مجھے اس لئے گھر میں آنے کا تامل ہوا کہ جہاں تصویر ہو یا کتا ہو وہاں ہم نہیں آتے"۔ جب رحمت کے فرشتے رسول اللہ کے گھر میں نہ گئے تو ان لوگوں کی کیا حقیقت ہے کہ ان کو جہنم کا شدید ترین عذاب نہ ملے گا؟ مولوی صاحب "اسلام اور قرآن مجید سے مدافعت"۔ (صفحہ الف) کا عاقبت نااندیشی سے نرالہ طریقہ ایجاد کیا۔ (صفحہ ۱۰۷) اور دوسروں کا شگون بگاڑنے کی خاطر اپنے لئے عاقبت کا عذاب مول لے لیا۔ اس میں وہ آنجہانی مرزائے قادیانی (غفر اللہ ذنوبہ) کے نقش قدم پر چلے۔ (ریویو آف ریلیجینس۔ قادیان بابت فروری ۱۹۴۲ء صفحہ ۵۵) اور قرآن کو بھول گئے۔ **نَسُواْ اللّهَ فَنَسِيَهُمْ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ هُمُ الْفَاسِقُونَ**۔ وہ خدا کو بھول گئے۔ پس خدا بھی ان کو بھول گیا۔ بے شک وہ فاسق ہو گئے۔ (سورہ توبہ آیت ۶۸)۔

سمجھائیں جائیں گے تمہیں ہر لحظہ ہر گھڑی
مانو نہ مانو اس کا تمہارا اختیار ہے

مولوی ثناء اللہ اور مسیح کی دعائے مغفرت

مولوی ثناء اللہ صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں

"مسیح کو دشمنوں نے ستایا اور آپ نے ایسے وقت میں معاف کیا جب کہ آپ بدلہ نہ لے سکتے تھے۔ مگر رسول عربی نے اپنے ظالم دشمنوں کو ایسی حالت میں معاف کیا جب کہ آپ ابروئے چشم کے ایک اشارے سے سب کا قتل عام کرا سکتے تھے"۔

تواضع زگردن فرازاں نکوست
گداگر تواضع کند خوئے اوست

(صفحہ ۱۶۵)

ہم اس بات سے قطع نظر کرتے ہیں کہ آپ نے حضرت روح اللہ کی شان میں یہاں اور (صفحہ ۴۸) اور دیگر مقامات میں مرزائے قادیانی کی طرح سب و شتم روا رکھا ہے۔ مولانا کا مطلب یہ ہے کہ صرف اسی شخص کی دعائے مغفرت خدا کے حضور قابل قبول اور انسان کے نزدیک قابل تحسین ہے جس میں بدلہ لینے کی خواہش اور طاقت ہو۔ اور اس کے باوجود وہ بدلہ نہ لے کلمتہ اللہ میں جذبہ انتقام تو نہیں تھا۔ کیونکہ آپ اس کو نہ صرف مکروہ بلکہ حرام سمجھتے تھے (متی ۵ باب۔۱۸ باب، مرقس ۱۱:۲۵ وغیرہ) گو آپ بدلہ لینے پر قدرت اور اختیار رکھتے تھے (متی ۲۶:۵۳۔ یوحنا ۱۰:۱۷۔ فلبیوں ۲:۸ وغیرہ)۔ پس آپ کی یہ شرط بھی پوری ہو گئی لیکن آپ کا مفروضہ جو اس اعتراض کی بنا ہے غلط ہے۔ دیکھئے جب رسول عربی اور مسلمانوں پر مکی زمانہ میں طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے تو آپ ان کو منجی عالمین کا نمونہ دکھلا کر تسلی دیتے اور فرماتے "تم سے پہلے ایک نبی تھے۔ ان کی قوم نے اس کو اس قدر مارا کہ خون آلود کر دیا اور وہ نبی اپنے منہ پر سے خون پونچھتے جاتے اور فرماتے جاتے تھے۔ اے اللہ میری قوم کی خطاؤں کو بخش دے کیونکہ وہ نہیں جانتے"۔ (بخاری جلد سوم صفحہ ۲۴۹) جب آپ کو جنگِ اُحد میں کفار کے ہاتھوں شکست ملی اور آپ کا سر اور چہرہ زخمی کیا گیا اور آپ کے دانت توڑ دئے گئے کیا آپ کا صبر و برداشت اس زمانہ میں آپ کے فارسی شعر کے مصداق تھا اور آپ کی تواضع "گدایانہ" تھی؟

مولوی صاحب غلط فرماتے ہیں کہ رسول عربی نے فتح مکہ کے روز اپنے دشمنوں کو معاف کیا۔ اس روز آپ نے سیاسی تدبیر اور دور اندیشی سے کام لے کر ساکنین مکہ کو پناہ دی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے بدترین دشمنوں کو معاف نہیں کیا تھا بلکہ ان خون ہدر کر دیا اور حکم دیا تھا کہ ان کو جہاں پاؤ مار ڈالو۔ ان دشمنوں میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھیں۔ کیا آنحضرت نے جنگ بدر کی فتح کے بعد ابو جہل، نضر بن حارث، عقبہ بن معیط، وغیرہ بدترین دشمنوں کو معاف کر دیا تھا؟ کیا کعب بن اشرف، حیئ بن اخطب، سلام بن ابی الحقیق وغیرہ معاف کئے گئے تھے؟ کیا یہود کے قبیلہ بنی قریظہ کے تمام مرد قتل نہیں کئے گئے تھے؟ اگر مولوی صاحب تاریخ محمدی سے اس درجہ ناواقف ہیں تو ہم ان کی توجہ مشارق الانوار کی احادیث نمبری ۸۷۸، ۸۷۹، ۱۸۱۴، ۱۸۹۱، ۱۸۹۲، وغیرہ کی طرف مبذول کرتے ہیں۔ مولوی صاحب ضروران واقعات سے واقف ہیں۔ لیکن اپنے فتویٰ کو بھول گئے کہ "منصف مزاج لوگ مذہبی مباحث میں خاص کر اخفائے واقعات کرنا جرم عظیم سمجھتے ہیں" (صفحہ ۲۳)۔

انجیل جلیل اور بخاری شریف دونوں حضرت ابن اللہ کی دعائے مغفرت کا ذکر کرتی ہیں جو آپ نے اپنے دشمنوں کے حق میں کی تھی۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ اب بھی آسمان پر مرحوم مولوی صاحب جیسے دشمنوں کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ ہماری بھی یہی دعا ہے کہ خدا مرحوم کے گناہوں کو معاف فرمائے اور اس پر اپنی رحمت کے دروازے کھول دے۔

اللھمہ المفتح علیہ ابواب رحمتکہ

ہنری مارٹن اسکول

علی گڑھ

۲۵ارچ ۱۹۵۷ء

(برکت اللہ)